ایک ناول
احساس
عبدالرشید راہگیر (لداخی)

سلام و آداب کے بعد.....
محترم سلیم سالک کی خدمت میں
بخلوص و آداب
عبدالرشید راہگیر (لداخی)

(لداخ کے پسِ منظر میں) ایک ناول

احساس

عبدالرشید راہگیر (لداخی)

کتاب کا نام : احساس

جنس : ناول

مُصنّف : عبدالرشید راہگیر (لداخی)

سن اشاعت : ۲۰۱۱ء

تعداد : ۵۰۰

کمپیوٹر کمپوزنگ : سیدہ نعیمہ اختر

سرورق : جی احمد

قیمت : عام ایڈیشن: ۲۰۰ روپے

لائبریری ایڈیشن: ۲۵۰ روپے

چھاپ خانہ : جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد دہلی۔٦

"اس کتاب کی طباعت کے لئے جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکیڈیمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈیمی پر کوئی ذمہ داری عائید ہوگی۔

کتاب ملنے کا پتاہ

☆ کتاب گھر مولانا آزاد روڈ سرینگر

☆ بیسٹ سیلر بکس اینڈ سٹیشنریز دسکو سکول لالچوک سرینگر"

رابطہ کے لئے: ۹۴۱۹۷۲۹۷۳۱

انتساب

اُن تمام فرض شناس

اساتذہ کرام کے نام جو

مذہب ذات پات، رنگ ونسل

کا بھید بھاؤ کئے بغیر اپنی محنت

اور جانفشانی سے نئی پود کو

انمول رتنوں کی صورتوں میں

تراش تراش کر ملک وملّت کو

سونپنے کے بعد گمنامی کے

اندھیروں میں کھو گئے۔

عبدالرشید راہگیر لداخی

انتباہ

اس ناول ''احساس'' کے
سبھی کردار اور واقعات فرضی
ہیں۔ کوئی سی بھی مطابقت
اتفاقیہ ہوگی ۔ اسے فلمانے یا
دوسری زبان میں شائع
کرنے کے لئے مصنّف سے
اجازت لینا ضروری
ہے۔ بصورتِ دیگر قانونی
چارہ جوئی کی جائے گی۔

عبدالرشید راہگیر
(المعروف لداخی)

دیباچہ

عبدالرشید راہگیر کی کہانیوں کی بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں مقامی رنگ ملتا ہے مقامی حالات، واقعات ملتے ہیں اور مقامی و غیر مقامی کردار مقامی زندگی کے ان گنت پہلوؤں میں مقامی رنگ بھرتے ہیں، یہی بات اُن کے ناول ''احساس'' کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ راہگیر صاحب لداخ سے تعلق رکھتے ہیں اور احساس میں بھی انہوں نے لداخی ماحول کلچر معاشرے رہن سہن، تعلیم و تربیت، رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کی عکاسی قدم قدم اور لفظ لفظ میں اپنے انداز اور اپنے واشگاف لہجے میں کی ہے۔ لداخ کے تعلیمی پسِ منظر کو ہی راہگیر صاحب نے اپنی کہانی کا ایک حصہ بنایا ہے بدلتے وقت کے ساتھ عوام کے ذہن وفکر میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں لداخ کے لوگ اپنے بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں کیا چاہتے ہیں اور ان کی تعلیمی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے راہگیر صاحب کبھی دھیمے اور کبھی اونچے لہجے میں بات کرتے ہیں وہ ناول ''احساس'' کی کہانی میں زندگی کی تلخ سچائیوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں اور وہ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں، ناول ''احساس'' کی کہانی میں کئی کہانیاں اُبھرتی ہیں جو بظاہر پُرسکون نظر آتی ہیں لیکن اپنے اندر طوفان چھپائے ہوئی ہیں ان کہانیوں میں محبت کی بھی ایک کہانی ہے جو اپنی دھیمی رفتار کے ساتھ پوری کہانی پر چھائی ہوئی ہے۔!!

مجھے اُمید ہے کہ عبدالرشید راہگیر لداخی کا ناول ''احساس'' آپ کو پسند آئے گا۔!

نور شاہ

پیش لفظ

عبدالرشید راہگیر کو میں ان کے ادبی ذوق کی مناسبت سے تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال سے جانتا ہوں جب انہوں نے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ مدتوں پہلے جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی ادارت میں چھپنے والا جریدہ ''شیرازہ'' میں لداخ سے متعلق راہگیر کا ایک مضمون (لداخ۔ رہن سہن ولباس) اور لیہہ کے پسِ منظر میں تحریر ایک مختصر افسانہ ''مطلبی'' چھپا تھا۔ اسی دوران عبدالرشید راہگیر عارضہ قلب کی وجہ سے لیہہ سے تبدیل ہوکر سرینگر گئے۔ لداخ کی بلندی اور آب وہوا ان کو راس نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد ہمارا رابطہ منقطع ہوگیا۔ طویل مدت بعد حال ہی (فروری ۰۶ء میں) جموں میں جب ہماری ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ دو ناولٹ کے مسودے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اشاعت سے پہلے میں ان کو پڑھ لوں۔ دونوں ناولوں کے تھیم لداخ تھے۔ اتنی مدت لداخ سے دور رہ کر وہ لداخ کو نہیں بھولا تھا۔ آخر کیسے بھولیں؟ لداخ عبدالرشید کا آبائی وطن جو تھا۔

مجھے دونوں ناولٹ پسند آئے اور میں نے انہیں شائع کرنے کی رائے دی۔

ایک ناولٹ ''احساس'' لیہہ کے ایک دیہی اسکول کے گرد گھومتا ہے۔ وادی کشمیر سے دو اُستاد اِس اسکول میں تبدیل کئے جاتے ہیں۔ ایک وسیم صیغہ متکلم میں اپنے مشاہدات، تاثرات اور تجربات بیان کرتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سادہ سا موضوع ہے لیکن مصنّف نے اس میں اپنے طرزِ بیاں اور زورِ قلم سے رنگ بھر دیا ہے اور شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی

قائم رہتی ہے۔اس میں ایک اچھے ناول کے سارے عناصر جیسے سسپنس، کلائمکس، منظر نگاری اور کردار نویسی بہ احسن طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔اس لئے ناولٹ حقیقت نگاری کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا ناولٹ ''مہربان'' لداخ کی سماجی زندگی کے ایک اہم لیکن منفی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔لداخی سماج میں اونچ نیچ پائی جاتی ہے۔اور ایک طبقہ آج بھی نیچ مانی جاتی ہے اگرچہ تعلیم اور نئی روشنی کے ساتھ مثبت تبدیلیاں آ رہی ہیں۔

نام ونہاد نیچ طبقہ کی ایک لڑکی پر ایک غیر مقامی نوجوان فریفتہ ہوتا ہے۔لیکن ان کی راہ میں کئی رکاوٹیں ہیں۔قدم قدم سسپنس ہے۔قاری کو لڑکی اور اس کے محبّ سے ہمدردی ہوتی ہے حتیٰ کہ کہانی نقطہ عروج پر پہنچتی ہے اور قاری اطمینان کی سانس لیتا ہے۔

کوئی کوئی پیدائشی داستان گو ہوتا ہے۔عبدالرشید راہگیر میں داستان گوئی کی صلاحیت ہے۔وہ لفظوں کی جادوگری اور کہانی کے تانے بانے سے قارئین میں یاس وبیم اور خوشی و اُداسی پیدا کر سکتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایک فلم ساز ان ناولوں کو کیمرے کی آنکھ میں سموئے۔

عبدالغنی شیخ (لداخی)

جموں۔۵ر فروری ۲۰۰۶ء

حرفِ آغاز

ہر دور میں ایسے کتنے ہی مدبّر، صالح اور دور اندیش افراد گذرے ہیں جو ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر روایتی بھائی چارے کی فضاء کو خوشگوار بنائے رکھنے کی جدو جہد کرتے ہوئے امر ہو گئے۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقع دائمی کبھی نہیں ہوتا۔ بھلے ہی کبھی پت جھڑ کے موسم کی طرح دلوں کو اُداس کر کے نکل جاتا ہو۔ لیکن بہاریں پلٹ کر پھر آتی ہیں۔ پھول پھر کھلتے ہیں۔ بھلے ہی تُند ہوائیں آندھی اور طوفان کی طرح آ آ کر ہر سو تباہی مچا دیتی ہوں۔ گھر، گھروندے ملیا میٹ کر جاتی ہوں۔ لیکن پھر کچھ مدت میں سب کچھ پہلے جیسا ٹھیک ہو جاتا ہے یا ٹھیک ٹھاک بنا دیا جاتا ہے۔ زندگی پھر سے دوڑنے لگتی ہے مگر جب بھائی چارے کی فضا مکدر ہو کر دِلوں کے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ تو ان کے جُڑنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مکمل پیڑی کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں کربناک لمحوں کا احساس ماضی کی تاریک تہوں میں دب کر ماند پڑتا ہو گا۔

لداخ کے بودھ مسلم روایتی بھائی چارے کی ساری دُنیا میں نہ صرف دھوم ہے بلکہ مہذبانہ مہمان نوازی کی تو بڑھ چڑھ کر مثالیں دی جاتی ہیں جو لداخ قوم کے لئے باعث افتخار ہے۔ ہمیں اپنے آباواجداد سے یہی تو ورثے میں ملا ہے۔ اس ورثے کو قدرو منزلت اور بہترین حکمت عملی کے ساتھ نئی نسلوں میں جوں کا توں منتقل کرتے رہنا نہ صرف لداخی قوم کی ذمہ داری ہے بلکہ فرض اولین بھی۔

غالباً میں نے ۷۷-۱۹۷۶ء کے آس پاس سے ہی ادب کے میدان میں طبع آزمائی کا آغاز کیا ہو گا۔ تب مقامی اخباروں میں لکھنے کے علاوہ کلچرل اکادمی کشمیر کے ماہانہ رسالہ ''شیرازہ'' سے بھی وابستہ رہنے کا موقع ملا۔ ''شیرازہ'' میں چھپنے والے افسانچہ ''مطلبی'' اور

مختصر مسودہ ''لداخ۔ رہن سہن اور لباس'' سے حوصلہ پا کر مزید لکھتے رہنے کا ارادہ کیا۔ لیکن شومئی قسمت، صحت کی خرابی سے صحت کی بحالی تک لگ بھگ دس گیارہ سال کی گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی...... صحت کی بحالی کے بعد یہ سوچ کر دوبارہ قلم سنبھال لیا کہ چلو سماجی سُدھار کی کوشش کے ساتھ ساتھ دم توڑتی اردو زبان کی بھی مقدور بھر خدمت کرتا چلوں۔ پس مقامی اخبارات اور پندرہ روزہ کرگل نمبر (رنگ یُل) سے جُڑے رہنے کی کوشش میں مزید کئی کہانیاں، افسانچے، مسودے اور منظومات لکھ ڈالیں جو قارئین کی نگاہوں سے ضرور گذری ہوں گی......

۱۹۸۹ء سے جاری نا مساعد حالات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہماری ریاست کا شاید ہی کوئی حصہ ان حالات کی زد سے بچا ہو۔ اسی سے متاثر ہو کر راقم نے ناولٹ ''اِحساس'' کی تصنیف کر کے کلچرل اکادمی کے سپرد کر ڈالی تا کہ کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد ادارے کی جانب سے کتاب کی اشاعت کے لئے مناسب معاونت دستیاب ہو سکے۔

پیش لفظ میں نامور قلم کار محترم عبدالغنی شیخ لداخی نے زیرِ نظر ناول ''احساس'' کو اس وجہ سے بار بار ناولٹ لکھا ہے کیونکہ فروری ۲۰۰۶ء میں اُن کی نگاہ سے گزرتے وقت یہ کتاب سچ مچ میں مختصر ہونے کے سبب ناولٹ ہی کہی جانے کے لائق تھی۔ زیرِ نظر ناول کو دلچسپ اور بامعنی بنانے میں راقم الحروف کتنا کامیاب ہے اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

رہا دوسرا ناولٹ ''مہربان''...... تو وہ بھی عنقریب اشاعت کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

میں معرُوف قلمکار محترم عبدالغنی شیخ لداخی، محترم نور شاہ صاحب اور محترم شیخ بشیر احمد صاحب کا دل کی گہرائیوں سے قدم قدم راہنمائی کرنے پر مشکور و ممنون ہوں اور ساتھ ہی میں اپنے ہر دل عزیز دوست پرویز احمد ملک، غلام جیلانی شیخ اور بشارت احمد بابا کا بھی بے حد ممنوں ہوں کہ انہوں نے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی۔

عبدالرشید راہگیر (لداخی)

باب اول

ہتھکڑیوں سے لیس پولیس کی ایک ٹکڑی گاؤں میں دندناتی داخل ہوئی تو نہ صرف بھگدر مچ گئی بلکہ جنگل کے آگ کی طرح وردی پوشوں کے آنے کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔

گاؤں والے ان کی آمد کا سبب بخوبی جانتے تھے۔لہٰذا وجہ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ جہاں جہاں سے جس جس بستی سے گذرے ایک تہلکہ مچتا گیا۔انہیں دیکھنے مرد و زن، چھوٹے بڑے، اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ آئے۔جو راستے میں ملے وہ راہنمائی کے لئے ساتھ ہو لئے۔قصورواروں کی مخبری برابر ہو چکی تھی۔کھیتوں کنارے ندی کے ساتھ والی پگڈنڈی پر جوں جوں آگے بڑھے، ساتھ ہونے والوں کا قافلہ سا بنتا گیا۔

چلچلاتی دھوپ سے فضا میں حرارت بڑھنے کے ساتھ ہی سب کچھ اُجلا اور روشن ہو چکا تھا۔مگر گذشتہ واردات نے دِلوں کے نہاں خانوں کی ضیا بجھا کر رکھ دی تھی۔

رگزن کے ہم جماعت دوست نمگیل نے پولیس کی آمد کے بارے میں سُنا تو اُس کے ہوش خطا ہو گئے۔ پاؤں تلے کی زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ ڈر کے مارے حلق خشک ہوا۔ کیوں نہ ہوتا۔گذشتہ رات کی واردات میں رگزن کے ٹولے میں وہ بھی جو شامل تھا۔

کوئی پل ضائع کئے بغیر وہ بھاگ بھاگ کر دوستوں کے گھر پہنچا۔اُنہیں اشاروں کی مدد سے باہر بُلا کر قریب کے باغیچے میں لے گیا۔

"نمگیل کچھ بتاؤ گے بھی..............کیا ماجرا ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

''بتاتا ہوں بتاتا ہوں......ذرا دم تو لینے دو۔''

دوڑتے بھاگتے اُس کی حالت غیر ہوگئی تھی۔وہ ہانپتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''ہمیں پکڑنے گاؤں میں پولیس آئی ہے............؟''

سبھی چونک پڑے اور گھبراہٹ میں دوہرا بیٹھے۔

''پولیس۔''

پولیس کا نام دُہراتے ہی تینوں کی سِٹی پٹی گم ہوگئی۔

انہوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر گھبرا کر بولے۔

''اب کیا ہوگا۔''

ٹشی نے تیزی سے پوچھا۔

''کیا رگزن کو اس بات کی خبر ہے؟''

''شاید نہیں۔''نمگیل کے جواب دیتے ہی ٹشی بولا۔

''تو چلو اُسے بھی خبر کرتے ہیں۔''

''ہاں ہاں وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔''موروپ نے قدم بڑھاتے ہوئے پہل کی۔

''دوڑ کے جانا ہوگا۔جلدی چلو۔کہیں ہم سے پہلے پولیس نہ جا پہنچے۔''

سبھی ریس کے گھوڑوں کی طرح سرپٹ دوڑے اور ندیاں پھلانگتے ،کھیت ، پیڑ، پودے تیزی سے پیچھے چھوڑتے ہوئے رگزن کے گھر جا پہنچے۔

رگزن اپنے صحن میں پولیس کی آمد سے بے خبر مکان کی دیوار سے ٹیک لگائے گُم صُم بیٹھا تھا۔آج اُس نے خود کو سنوارنے کی کوشش بھی نہ کی تھی............ بے ڈھنگے بال دیوانوں کی طرح ماتھے پر اُلجھے پڑے تھے۔کل کی کرتُوت نے رات بھر پشیمانی کی آگ میں جلا کر رکھ دیا تھا۔ناراضگی کی وجہ سے والدین بھی شام سے ہی پوچھنے کو نہ آئے تھے۔وہ بھی باورچی خانے میں گُم صُم بدنصیبی اور شرمندگی کا رونا روتے رہے تھے۔شاید مایوسی کے مارے اُن کے حلق سے نوالہ

بھی نہ اُترا ہوگا۔

صحن کی خاردار جھاڑیوں کی دیوار کے پرلی طرف سے نمکیل نے رگزن کو آنگن میں بیٹھے دیکھا تو دھیرے سے آواز دی۔

''رگزن۔اے رگزن۔گاؤں میں پولیس آئی ہوئی ہے.............''

پولیس کا نام سُنتے ہی رگزن کے کان کھڑے ہوگئے۔اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دوستوں کی طرف دیکھا۔پھر اَن سُنی کر کے دُبکا پڑا رہا۔

''رگزن۔اے رگزن۔سُنا نہیں کیا تم نے...........گاؤں میں پولیس آئی ہوئی ہے۔ پل بھر میں یہاں پہنچتے ہی ہوں گے۔آؤ چلو بھاگ چلیں۔جلدی کرو ورنہ ہتھے چڑھ جائیں گے۔''

رگزن ٹس سے مس نہ ہوا۔ان کی باتیں اَن سُنی کر کے سر جھکائے وہیں پڑا رہا۔

کچھ ہی پل میں بھگدر مچ گئی۔بستی کے بچے بھاگ کر پولیس کے قریب پہنچنے کی خبر لے آئے.................ہر سو ایک شور بلند ہوا۔

''رگزن کو پکڑنے پولیس آرہی ہے۔''

کوئی کہتا ''اب مزا آئے گا۔ساری ہیکڑی نکل آئے گی۔''

کوئی کہتا ''رگزن کو خبر کردو۔بھاگنے کے لئے کہو۔''

کوئی کہتا ''ہاں ہاں بھگادو۔ورنہ پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔''

کوئی کہتا ''رہنے دو۔ایسے انسان کی یہی سزا ہے۔''

کوئی کہتا ''رگزن کو چھپادو۔''

غرض جتنے منہ اُتنی باتیں ہوتی رہیں۔رگزن پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔بلکہ بے پرواہ ہوکر بیٹھا ہی رہا۔وہ چاہتا تو بھاگ کر کچھ پل کے لئے روپوش رہ سکتا تھا۔

پولیس پارٹی آنگن میں چلی آئی تو رگزن کے والدین سیڑھیوں سے بھاگتے ہوئے اُتر آئے اور ہاتھ جوڑ کر تھانیدار کے روبرو کھڑے ہوگئے۔

''یہاں صنم وانگیل کون ہے؟''

تھانیدار نے رعب دار آواز میں پوچھا تو صنم وانگیل نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

''ہم ہوں مائی باپ''۔

''تمہارے لڑکے کا نام رگزن ہے؟''

''جی مائی باپ''۔

''ہم اُسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔کہاں ہے وہ۔''

''وہ سامنے دیوار کے پاس بیٹھا ہوں جناب''۔

''ہُم م م.........تو یہ ہے وہ لڑکا.........''

''تھانیدار نے اُس کی طرف عقابی نظر سے دیکھا۔پھر سپاہیوں سے کرخت لہجہ میں کہا۔

''اسے میرے قریب لے آؤ۔''

سپاہی حکم کی تعمیل میں گئے اور اُسے بالوں سے پکڑ کر تھانیدار کے قریب لے آئے۔

تھانیدار غصیلی آواز میں گرج کر بولے۔

''ہُم م م...... تو تُم ہی گاؤں کے سَر پھرے غنڈے ہو۔''

رگزن سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔کچھ نہ بولا۔

''کہاں ہیں تمہارے باقی ساتھی......؟''

اُس نے دوبارہ پوچھا لیکن رگزن کی زبان گونگی بنی رہی۔

اس بیچ گاؤں کا نمبردار بھی پہنچ گیا۔تھانیدار اُنہیں پہچانتے تھے۔اُن کی طرف سے ''جولے'' سُنتے ہی تنقیدی انداز میں بولے۔

''جولے جولے۔آیئے نمبردار جی آیئے......آپ کے گاؤں میں ڈاکٹر،انجینئر اور سکالروں کے بجائے یہ کیسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں۔ایسے ہی بدمعاش اور موالی پیدا ہوتے گئے تو سوچیئے گاؤں کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہمارے زمانے میں پڑھ لکھ کر آدمی موم ہو جاتا تھا۔دل

ودماغ میں شرافت بھر جاتی تھی۔ کسی کی مدد کرتے تو یہ سوچ کر جی خوش ہوتا کہ چلو اس بار بھی اچھا کام کر کے پُن کما لیا اور اگلے کام کا ارادہ بھی اوروں کی دُکھ تکلیفیں دور کرنے کی غرض سے ہی ہوتا...... ہر بار یہی کوشش ہوتی نمبردار جی کہ چھوٹے بڑے سبھوں کو خوشی ملے۔ ایک دوسرے سے مدد کی اُمید بندھی رہے...... دیوتا اور بھگوان خوش ہوں...... ہوتا تھا کہ نہیں......؟"

"جی جناب ...... آپ ٹھیک فرماتا ہوں۔" نمبردار نے بیتی یادوں کو سمیٹ کر مختصر سا جواب دیا تو تھانیدار دوبارہ بولے۔

"تو پھر اب یہ کیا نمونے پیدا ہونے لگے ہیں۔ اڑیل بیلوں کی طرح بڑی ہمت بڑھنے لگی ہے ان کی...... حوالات کی ہوا لگے گی تو خود بہ خود سب کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے......"

پھر تحکمانہ لہجے میں ایک سپاہی سے بولا۔

"......ڈال دو ہتھکڑی......"

سپاہی رگزن کی کلائی میں ہتھکڑی پہنانے ہی لگا تھا کہ نمبردار نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"تھانیدار صاحب ...... کم از کم ہماری بستی سے ہتھکڑی کے بغیر لے جاؤ جی۔ اس کے ماں اور باپ بڑا ہی شریف آدمی ہوں۔ اُن کو دُکھ ہوگا جی......"

تھانیدار نے ابا وانکیل اور اس کی بیوی کی طرف دیکھا۔ دونوں بے چارگی کے عالم میں ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ اُن کی مُروت کا خیال کر کے وہ دوبارہ سپاہی سے بولے۔

"ٹھیک ہے ہتھکڑیاں مت ڈالو۔ ایسے ہی پکڑے رکھو۔"

اس کے بعد وہ دوسرے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے بولا۔

"تم باقی کے سپاہی اس کے تینوں دوستوں کو جہاں کہیں بھی ہو گرفتار کر کے لے آؤ۔ اُن کے نام نمگیل ولد پلدن، مورپ ولد ژھےتن اور ٹشی ولد پلجور ہیں۔"

"حکم کی تعمیل میں سپاہیوں کی جانب سے لیس سر (Yes Sir) کہنے کی دیر تھی کہ خاردار دیوار نما جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تین لڑکے بھی احساس خطاء کے اثر سے پشیماں ہو کر

آنگن میں چلے آئے اور تھانیدار کے روبرو سر جھکائے کھڑے ہو گئے۔

''کون ہیں یہ لڑکے۔؟''

نمبردار نے لڑکوں کو پہچانتے ہوئے کہا۔

''یہی وہ تین لڑکا ہوں جناب جس کو آپ تلاش کرتا ہوں۔''

''اچھا......'' تھانیدار کے لہجے میں طنز اُبھر آیا۔ ''بڑے ٹوٹے ہوئے لگتے ہیں۔ لے چلو سب کو تھانے۔''

تھانیدار کا حکم سُننے کے باوجود بھی کوئی منت سماجت کرنے نہ آیا۔ ابا وانگیل نے بھی پہل نہ کی۔ رگزن کی ماں دل پر پتھر رکھے اپنے بیٹے کو گرفتار ہو کر جاتے دیکھتی رہی۔

....

سب کچھ اتنا سویرے ہوا کہ وسیم اور اکرم کو پتہ ہی نہ چلا۔

صبح کے دس بجتے ہی اسکول کی گھنٹی بجی۔

آج سب کچھ پہلے جیسا نہ تھا۔ بچے روز کی طرح اُدھم مچاتے نہ آئے تھے۔ ہر طرف خاموشی سی چھائی تھی۔ پیڑ، پودے، چرند و پرند، ندی، جھرنے یہاں تک کہ بچے بھی خاموش تھے۔ باتیں کرنے کے لئے سرگوشیانہ لہجہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ اسکول کا اسٹاف بھی ایک دوسرے سے نگاہیں نہ ملا پا رہے تھے۔ کیسے ملاتے۔ بات ہی جو انہونی ہوئی تھی۔

صبح کی دعائیہ مجلس بہت ہی مختصر طریقے سے ہوئی۔ کسی نے کوئی لیکچر نہ جھاڑا۔ بچے خاموشی سے قطاروں میں کلاسوں کو چلے گئے۔

فونچک چپراسی نے گھنٹی بجادی۔

ٹائیم ٹیبل کے مطابق میرا پہلا پیرڈ (Period) دسویں جماعت میں تھا۔ لیکن گزشتہ حادثے نے اتنا بددل کر دیا تھا کہ کلاس میں جانے کا من نہ کیا۔ یہی حالت اکرم اور غلام قادر کی بھی تھی۔ اس حادثے سے سبھوں کے درمیان ایک عارضی دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر

یونہی کلاس کے باہر بیقراری سے ٹہلتا رہا۔ پھر مجھ سے رہا نہ گیا۔ سوچا کہ چلو کچھ نہ سہی تو بے دِلی سے ہی دو حرف پڑھا کر آج کی کمائی کو حرام میں جانے سے بچالوں، انتہائی جرأت کے ساتھ کلاس مین داخل ہوا۔ بچّے ہمیشہ کی طرح اسٹینڈ اپ (Stand up) کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پورے کلاس کو سرسری نگاہوں سے ٹٹولا۔ مجھے رگزن، موروپ، نمکیل اور ٹشی کے علاوہ چند دیگر بچوں کی بھی غیر موجودگی محسوس ہوئی ۔ چھورول اگلی قطار میں چند سہیلیوں کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ کوئی مجھ سے کچھ نہ بوَلی۔ نہ میں نے غیر حاضر بچوں کے بارے میں جاننا چاہا۔ کیونکہ اب مجھے سارے شاگردوں سے تسلّی ہو چکی تھی۔

انہیں سِٹ ڈاوُن (sit down) کہہ کر بٹھانے کے بعد حاضری کرنے کے بجائے چند سوالات دِکھا ڈالے۔

کل شام لاما جی دورجے، رگزن کا باپ وانگیل، نمبردار اور اُس کی بیٹی چھورول کے علاوہ گاؤں کے کئی معتبر لوگ ہمارے ڈیرے سے دیر گئے رخصت ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد رات بڑی بے چین گذری تھی۔

اب بھی دل بوجھل بوجھل تھا۔

چھورول کام لکھتے لکھتے میری طرف بیقراری سے دیکھنے لگی۔ شاید کچھ کہنا چاہتی ہوگی۔ اُس نے کل اپنی وفاداری اور چاہت کا جلوہ دکھا کر مجھے ایسا قائل کر دیا تھا کہ اب میں نے سچ مچ اُسے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دے ڈالی۔

چھورول کو بے چین دیکھ کر میں نے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو تم......؟"

"جی ماسٹر جی......گاؤں میں صبح پولیس آئی تھی۔"

"تو.........؟"

وہ رگزن اور اسکے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔"

''ہم م م......'' میں نے خیالوں میں جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''کسی نے مزاحمت نہیں کی۔''؟

''جی نہیں.....اب سبھوں کو اُن سے نفرت ہو چکی ہے۔ اسکے ابا لے نے بھی نہیں روکا۔ کسی نے بھی پولیس کی منّت سماجت نہیں کی۔ اُس کی اماں لے نے بھی نہیں.....ابا وانگیل نے سبھوں سے کہہ رکھا تھا۔ کہ پرانسپت کے لئے دل پر پتھر رکھنا ہوگا.....اور تو اور رگزن خود بھی پولیس کی خبر سُن کر نہیں بھاگا۔ وہیں انتظار کرتا رہا....... پولیس کو اُسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی.....اسکے دوست موروپ، نمگیل اور ٹشی گرفتاری کے لئے خود ہی چلے آئے...اچھا ہوا ماسٹر جی۔ پولیس سب کو پکڑ کے لے گئی۔ لوگ کہہ رہے تھے ان کی یہی سزا ہے۔''

''ہم م م........'' چھورول کی باتیں سُن کر میں خاموش ہو گیا۔

جانے کیوں کلاس میں ان بچوں کی عدم موجودگی میرے دل کو پھر بھی بے چین کیئے دے رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں ان کا استاد اور خیر خواہ تھا۔

''چند پیرڈ ختم کرنے کے بعد دوپہر تک بے چینی کے عالم میں یونہی ٹہلتا رہا۔ پھر جب لنچ بریک (lunch break) کی گھنٹی بجی تو چھورول کو آنے کا اشارہ کر کے چپکے سے نکل گیا.......وہ میرے پیچھے چلی آئی۔ ہم دونوں کھیتوں کے نشیب و فراز سے ہوتے ہوئے سڑک پر پہنچے۔ چھورول نے چلتے چلتے پوچھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں ماسٹر جی......؟''

''کہیں نہیں........یہیں پولیس چوکی تک۔''

''جی سر..... پولیس کو ان کا کچا چٹھا معلوم ہو جانا چاہیئے۔''

میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے چلتا رہا۔ چلتے چلتے میرے خیالات ماضی کی دنیا میں پرواز کر گئے۔ ذہن کے پردے پر ابتداء سے گذشتہ حادثے تک کی ساری باتیں قلمی مناظر کی طرح واضح ہونے لگیں.........میں ماضی میں ڈوبتا چلا گیا۔ ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اور وہ ماضی

باب دوم

دل میں ماسٹر گریڈ پانے کی تڑپ مُدّتوں سے تھی۔ اب کے جو ملا تو بھاری قیمت چکانا پڑی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات..... مرتا کیا نہ کرتا ماں باپ بیوی بچے گھر بار پورے خاندان کو خیر باد کہہ کر دور اُفتادہ پردیس لداخ کو چلا آیا........ ماسٹر گریڈ پر موشن کیا ملا کہ دو سال کیلیئے جلا وطن ہی ہو گیا۔ شاید اس کوہستانی علاقے میں بھی نصیب کے کچھ دانے کاتب تقدیر نے میرے حق میں لکھ چھوڑے تھے۔ یہ دانے کھائے بنا بھلا میں کیوں کر بچ پاتا۔

دو دنوں کی قدم قدم صعوبتوں بھری لمبی مسافت جھیلنے کے بعد لیہہ پہنچا تو سارا بدن تھکان سے چُور ہو چکا تھا۔ انگ انگ کے جوڑ گویا کُھل چکے تھے۔ جلدی ہی کسی مستقل قیام گاہ کا انتظام اور چند دن کے آرام کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے لئے ضلعی ناظم تعلیم سے ایک عدد نیا حکم نامہ پھر سے حاصل کرنا لازمی تھا۔ جس سے اُس اسکول کا تعین ہو جاتا جہاں مجھے "سزا" کے دو سال کاٹنے تھے۔ گھر سے بدر ہونا سزا نہیں تو اور کیا ہے.........؟ یہ خیال بھی رہ رہ کے ستا رہا تھا کہ اس پردیس میں کسی ہم زبان اور ہم خیال ساتھی کے بنا دو سال کا طویل عرصہ گذارنا کیسے ممکن ہوگا۔ لیکن شاید ناظم تعلیم اور اس کے ماتحت سرکاری کارکن ازراہِ انسانیت اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہونگے کہ دُور افتادہ علاقے کے دیہاتی اسکولوں میں متعین ہونے والے ہر نووارد ملازم کا کم از کم ایک عدد ہم زبان اور ہم وطن پردیسی ساتھی ضرور ہو جس کی شرکت سے دیارِ غیر میں مقررہ معیاد تک دل نہ لگنے کی شکایت کا ازالہ ممکن ہو سکے۔

یہی وجہ تھی جس دن، دفتر سے ایڈجسٹمنٹ آڈر ملا، یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ایک ہم وطن بھی میرے ہمراہ میرے ہی سکول میں تقرّر کیا جا چکا ہے۔ اگر چہ ہمارا تبادلہ دیہات کے ہائی اسکول میں ہوا تھا لیکن ایک ہم وطن ساتھی کے پانے سے میرے دل کی خوشی دوبالا ہوگئی۔ خود بہ خود میرے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی چلی آئی اور میری تھکان آدھی سے زیادہ جاتی رہی.......... میں اُس ہم وطن اجنبی سے ملا تو اُس کو نہایت مایوس پایا۔ لیکن جب اسے حکم نامے سے آگاہ کیا تو حیرت اور خوشی سے اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے آسمان کی جانب نگاہیں اُٹھائیں۔ یکا یک فرطِ مسرت سے اس کی دونوں آنکھیں بھر آئیں۔ اب جو گردن سیدھی کر کے میری جانب ممنون انداز میں دیکھا تو آنسوں چھلک کر رخساروں پر آگرے۔ میرا بھی جی بھر آیا۔ واقعی یہ جذباتی منظر تھا.......... میں نے اُسے دلاسا دیا۔ کچھ ہمت بندھائی۔ پھر اکٹھے ڈیرہ جمانے کا پروگرام بنا کر بازار سے اشیائے ضروریہ خرید کر نئی منزل کی جانب روانہ ہونے کے لئے ایک بجے کی بس پکڑی جو بلندی پر کھڑی قدیم شاہی شکستہ عمارت پیچھے چھوڑ کر منے ژھلڑ ونگ کے پیچ دار موڑوں سے اُتری اور ریڈیو اسٹیشن و پیٹرول پمپ سے ہوتی ہوئی ائیر پورٹ کے دائیں بغل کی سڑک پر تھرکتی نامعلوم منزلوں کی جانب چل دی۔ پل بھر کے لئے تو یوں لگا جیسے ہم پھر سے واپس اپنی کھلی وادی کشمیر کو روانہ ہوئے ہیں، لیکن دراصل یہ میری بھول تھی۔ راستہ بے شک کشمیر کو جا رہا تھا۔ لیکن بس کی منزلیں لیہہ کے مضافات میں بر لب سڑک بسے مختلف دیہات اور گاؤں تھے جو مختلف فاصلوں پر نشیب و فراز میں دور دور تک آباد تھے۔

بس میں مقامی مسافروں کی اکثریت تھی۔ جن میں ہر عمر کے مرد و زن سوار تھے۔ جو لداخ کے روایتی لباسوں میں خوب جچ رہے تھے۔ ان کے گال سیبوں کی مانند سُرخ تھے۔ ان میں کچھ لوگ خاموش تھے اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں مگن ......ہم دونوں کو تین سیٹوں والی ایسی جگہ مل گئی جس پر ایک مقامی نوجوان پہلے سے ہی کھڑکی کے سامنے براجمان تھا۔ چلتی

ہوئی بس میں اُس نے کئی بار سوالیہ انداز میں ہماری جانب دیکھا۔شاید ہمارے بارے میں جاننا چاہتا تھا...... آخر اُس سے نہ رہا گیا تو پوچھ ہی لیا کہ ''ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں''؟ اُسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہم مُدرس ہیں اور گاؤں کے ہائی اسکول جا رہے ہیں۔

بس اپنی رفتار پر چلتی رہی۔ گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ہم اپنے مطلوبہ گاؤں پہنچ گئے۔ ہمارا تبادلہ جس گاؤں میں ہوا تھا اس کی مختصر آبادی بودھ فرقوں کے سادہ لوح، محنت کش، خوش مزاج اور مہمان نواز مرد و زن پر مشتمل تھی۔گاؤں اگرچہ مختصر تھا مگر پہاڑی سلسلوں کے دامن میں پھیلے کھیتوں کی ہریالی اور سیبوں کے چھوٹے چھوٹے باغات نے اسے اور لالہ زار بنا دیا تھا۔ مزید رونق آس پاس کے کھیتوں میں سے گذرنے والی سنہری ندیوں نے روپہلی لکیریں کھینچ کر بڑھا دی تھیں۔گاؤں پہاڑی سلسلوں کے ڈھلوان دامن میں کُھلے کُھلے تہہ دار کھیتوں کے اغل بغل میں بکھر کر کچھ یوں بسا تھا کہ گاؤں کے بیچوں بیچ سرینگر لیہہ رابطہ والی قومی شاہراہ ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑی سلسلوں کے پیچھے جا کر گم ہو گئی تھی۔سپاٹ چھتوں والے ایک اور دو منزلہ مکانات کچھ کچھ فاصلے پر جا بجا نظر آ رہے تھے جن میں سے کچھ سڑک کے کنارے اور کچھ کھیتوں کے بیچ کھڑے تھے۔۔۔گاؤں کے سارے نالے اور شفاف ندیاں شاہراہ پر بنے کئی کلوٹوں کے نیچے سے بہہ کر پرلی طرف کے مکانوں کے دامن کو چھوتی ہوئی کھیتوں کے بیچ سے گذر کر نیچے نشیب میں چنگھاڑنے اور ٹھاٹھیں مارنے والی منہ زور دریائے سندھ کی تیز و تند موجوں میں جا ملتی تھیں۔ دریا کے پار ایک لامتناہی پہاڑی سلسلہ لاتعداد چوٹیوں کو پرچموں کی طرح بلند کئے پیچ و بل کھاتا سرحدوں کے پار شاید چین سے بھی آگے اپنے پنجے گاڑھتا ہوا چلا گیا تھا۔

حسب دستور گاؤں کے نمبردار نے میرا اور میرے ساتھی اکرم کے ٹھہرنے کے لئے کمرے کا مناسب بندوبست کر دیا تھا............ مجھے یاد ہے۔جب لیہہ کی لوکل بس جس میں ہم دونوں بھی سوار تھے اس گاؤں میں آ کر پل بھر کے لئے رُکی تو ہماری نشست پر بیٹھے نوجوان کی چند نامانوس آوازوں پر ہمارے استقبال کے لئے اسکول کا سارا عملہ ارکان، سارے طلباء

طالبات یہاں تک کہ سارا گاؤں سرِ راہ اُمڈ آیا............ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کے کنارے گاؤں والوں کا جم غفیر موجیں مارنے لگا...... بس رُکی ہی تھی کہ لوگوں کے ہجوم نے بس کو گھیرے میں لے لیا...... ہمارے اُترنے تک بس کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے تا کا تا کی ہوتی رہی.......... ہر کوئی ہمیں دیکھنے کے لئے بے تاب تھا........... ہم بس سے اُترے ہی تھے کہ ہر طرف ایک شور بلند ہوا۔ مقامی بولی میں ایک دوسرے کو پیغامات دئے جانے لگے جس کا مفہوم اکرم کی وضاحت کے مطابق کچھ یوں تھا۔

''ہاں ہاں آ گیا ہے'' ......ایک بولا۔''ارے دونوں کشمیری ہیں......''

دوسرا کہیں سے چّلایا۔

''سامان کہاں ہے..........سامان اُتارو''

تیسرے نے بس کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔

''چھت پر ہوگا...... معلوم کرو کیا کیا سامان ہے'' ......

دوسری طرف سے کوئی قیاساً بولا۔

''صندوق اور بستر ہوگا یا صندوق کے بدلے اٹیچی ہوگی......''

بھیڑ میں سے کسی نے آواز دی۔

''ارے نہیں نہیں......دو بستر دو اٹیچی ہوں گے..........''

پاس ہی کھڑے ایک معتبر شخص نے جو منکے پھیر رہا تھا پیار اور شفقت سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ارے ٹھہرو..........تمہیں پتہ نہیں چلے گا..........ٹھہرو ٹھہرو...........ماسٹر جی خود ہی دکھلا دیں گے..........''

درمیان میں کسی نے منع کر دیا۔

''بھئی انہیں چھت پر مت چڑھنے دو..........دونوں تھکے ہوں گے......''

معتبر شخص اپنا مشورہ منواتا دوبارہ بولا۔

"ارے بچو...........سامان کی نشاندہی کے لئے انہیں چڑھنا ہی پڑے گا۔"

چند لوگ بس کی چھت پر چڑھ چکے تھے لیکن بہت سے ایک جیسے سامان واسباب کے بیچ ان کی عقل کام نہیں کر پائی۔تبھی اُن میں سے ایک نوجوان معتبر شخص کی بات کی تائید میں بولا۔

"مے مے لے(نانا جی) ٹھیک کہتے ہیں۔انہیں چڑھنا ہی ہوگا...........نشاندہی ہو جائے تو سامان ہم خود اُتاریں گے..........."

مقامی لوگوں کے آپسی مکالموں کے دوران میرا ذہن اکرم کے وضاحت کرنے پر الجھا رہا۔جانے وہ اُن کی گفتگو سمجھ پایا بھی تھا یا یونہی قیاساً بولا تھا۔ویسے لوگوں کے حرکات وسکنات ان کی بولیاں سمجھنے میں مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔

لوگوں کے جم غفیر کو دیکھ کر ہم اس گمان میں تھے کہ شاید اس بس سے کوئی مہان ہستی، گیانی یا باراتی بھی اُترنے والے ہیں لیکن لوگوں کو جوش وخروش کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہماری جانب ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی.....سبھی خوش نظر آرہے تھے۔سبھوں کے جُھریوں دار چہروں پر شادمانی صاف عیاں تھی...........بچے تو بچے جوانوں نے بھی مُسکرا کر ہمارا استقبال کیا...........اجنبی ماحول اور انجان چہروں کے پُر تپاک استقبال نے ہمارے دِلوں میں ایسی جلترنگ بجادی کہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ہمارا اجنبی پن دل دماغ سے یک لخت دور ہو گیا.....چھوٹے بڑوں نے جھٹ پٹ صندوق اور بسترے بس کی چھت سے اُتار ڈالے......جہاں چند طلباو طالبات اور زندہ دل نوجوانوں نے سامان کو بانٹ کر اُٹھا لیا وہیں کچھ لڑکے ایک دوسرے پر سبقت لینے کے جذبے میں ہمارے کندھوں سے بھی یہ کہتے ہوئے بیگ اُتار لے گئے کہ...........

"ماسٹر جی آپ لمبی مسافت میں تھک چکے ہیں.....جھولا ہمیں دے دیجئے ہم لئے چلتے ہیں۔"

اِن کی اپنائیت اور شاگردانہ جذبہ دیکھ کر خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ہم ان کی بے مثال محبت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ہمارے اُترتے ہی بس اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

ہم دونوں گاؤں کے بزرگوں، جوانوں، طلبا و طالبات اور اساتذہ کے حصار میں ہر ایک سے باری باری رسمی گفتگو کرتے ہوئے اسکول کی طرف بڑھے۔ ان کی گفتگو میں محبت و ہمدردی اس قدر عیاں تھی کہ ہمارے ذہنوں سے اجنبیت کا احساس مٹنے لگا۔

ایک نہایت ضعیف و معمر شخص نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ماسٹر جی سفر میں کافی تکلیف ہوئی ہوگئی.........."

میں نے جواب دیا۔

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ...... سفر دشوار گذار اور اُبکانے والا ضرور تھا لیکن راستے بھر قدرت کے انمول نظارے دیکھنے کو بھی خوب ملے۔"

دوسرا شخص بولا۔

"یہ راستہ اکثر جگہ جگہ سے خراب رہتا ہے...... کہیں سنگریزوں کا سیلاب آیا ہوتا ہے...... کہیں چٹانیں کھسکی ہوتی ہیں...... کہیں گاڑیوں کے ٹکرانے سے دیر تک راستہ بند رہتا ہے...... مسافروں کو کافی پریشانیاں سہنی پڑتی ہیں......"

میرے بولنے سے پہلے ہی اکرم نے جواب دیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں...... ہمیں بھی کئی جگہوں پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا...... لیکن پھر بھی پہلے وقتوں کی نسبت آج ساری شاہراہ قابل تعریف ہے...... ماسوائے زوجیلا درّہ کے...... اس درّے پر سڑک شاید ہی کبھی ٹھیک حالت میں رہ سکے گی کیوں وسیم ٹھیک کہا؟"

اکرم اپنی بات ختم کر کے میری جانب دیکھنے لگا تو میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

"میں بھی یہی سوچتا ہوں...... زوجیلا اپنی ہٹ دھرمی کبھی نہ چھوڑے گی......"

میرے خاموش ہوتے ہی اسکول اسٹاف کے کشمیری اُستاد پنڈت بھوشن لال نے چپّی توڑی۔ بولے۔

"زوجیلا پہاڑ پر سُرنگ ہی عبور و مرور کے لئے کارگر ہو سکتی ہے اگر ایسا ہوا تو کم از کم پورا

سال یہ شاہراہ آمد رفت کے قابل رہ پائے گی ...... مگر بھگوان جانے وہ دن کبھی آئے گا بھی یا نہیں ......" یہ کہہ کر اُس نے لمبی سانس لی۔

ماسٹر دورجے جو اِسی اسکول کے دیرینہ مدرس تھے بڑے زندہ دل خوش مزاج پُھرتیلے اور ملنسار لگ رہے تھے۔ بھوشن لال کی بات ختم کرتے ہی یوں گویا ہوئے۔

"ہندوستان اب ہر معاملے میں خود کفیل ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی کے ہر میدان میں قدم رکھا ہے...... خلا میں مصنوعی سیاروں کی لائن لگادی ہے بھلا یہ زوجیلا کیا چیز ہے...... بھئی دیکھ لینا...... بھگوان نے چاہا تو مستقبل قریب میں زوجیلا پر سرنگ کی کھدائی کی خوشخبری بھی سُن ہی لیں گے......"

"ناممکن ہے دورجے صاحب.........." ماسٹر گوربچن سنگھ سے نہ رہا گیا اس نے دورجے پر چوٹ کی۔ دُورجے نے مایوس ہو کر پوچھا۔

"کیوں......؟ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں..........؟"

"دورجے صاحب سرکار نے لداخ کے لئے ایک متبادل سڑک کا بھی انتظام کر دیا ہے جو منالی سے لیہہ سِٹی تک آتی ہے...... بھلے ہی یہ سڑک سرینگر لیہہ شاہراہ کے مقابلے میں کم مدت کے لئے کھلی رہتی ہو پر ...... لداخ کے راشن کا کوٹا دونوں راستے سے وقت سے پہلے دھڑا دھڑ پہنچ کر پورا تو ہو جاتا ہے نا...... پھر بھلا دو دو سڑکوں کے ہوتے ہوئے سرکار زوجیلا سرنگ کے لئے رقم کثیر خرچ کرنے کی کیوں سوچے......"

ہمارے استقبال پر آئے ہوئے لوگ یعنی گاؤں والے ہمارے پیچھے چلے آرہے تھے۔ پتھروں اور ریگزاروں سے ہوتا ہوا آگے ہمارا راستہ خاردار دیواروں والی ایک تنگ گلی میں بدل گیا۔ دورجے کہہ رہا تھا۔

"بات راشن کوٹے کی نہیں ہے جناب...... بات آمد و رفت کی ہے...... منالی لیہہ شاہراہ تو صرف تین چار مہینوں تک ہی کھلی رہتی ہے۔ جب کہ سرینگر لیہہ قومی شاہراہ پر کم از کم چھ

مہینے تک بھی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کیا ہمارا انحصار سرینگر لیہہ شاہراہ پر زیادہ نہیں ہے..........؟"

دورجے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتا ہوا بولا۔

"..........ہاں بالکل ہے..........ہم سرینگر لیہہ شاہراہ پر منالی روڈ کی نسبت زیادہ تکیہ رکھتے ہیں اس لئے زوجیلا پر سُرنگ بنانے کی اشد ضرورت آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی...... اگر ایسا ہوا تو ہمارا لداخ چھ مہینوں کے بجائے کم از کم دس گیارہ مہینوں تک دوسرے بڑے شہروں اور ریاستوں سے جُڑا رہ سکے گا۔ کُھلی سڑکیں ہی تو ترقی کی نشانیاں ہوتی ہیں.........."

پنڈت بھوشن لال دورجے کی بات سے متفق تھے ان کی طرف مسکرا کر بولے۔

"واقعی یہ سولہ آنے کی بات کہی ہے۔"

گوربچن سنگھ کو مذاق سوجھا۔ ہنس کر پنڈت جی پر پنجابی لہجے میں چوٹ کی۔

"پنڈت جی ماراج (مہاراج)۔ آنے دو آنے کا زمانہ تو کب کا چلا گیا ہے۔ اب تو سو فیصد کینے (کہنے) کا زمانہ ہے..........سو فیصد کہیے سو فیصد.........."

شاید دونوں پردیس میں اکثر اسی طرح نوک جھونک کر کے دل بہلانے کے عادی رہے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ پنڈت جی کے چہرے پر ناگواری کے آثار ذرا بھر بھی نہیں اُبھرے بلکہ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور کھلتی رہی۔ انہوں نے جھٹ سے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"گوربچن جی کمال ہے..........اس تنگ وادی میں اتنی گرمی بھی تو نہیں کہ عقل پگھل کر بھاپ ہو جائے..........دیکھئے تو..........کیسی خوشگوار ہوائیں چل رہی ہیں۔"

"ماراج پنڈت جی......میں نے ایسا کیا کہہ دیا..........؟" گوربچن تنک کر بولے۔

"آپ نے جو کہا ٹھیک ہی کہا ہوگا لیکن اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے..........عقل والے کبھی کبھی حساب کو بھی محاورے کے انداز میں لے لیا کرتے ہیں۔ پھر چاہے حساب جدید

ہو یا قدیم............ سمجھا کیجئے............''

''اچھا تو محاورہ کہہ رہے تھے آپ............ لیکن آپ تو ہندی کے اُستاد ہو............''

''لو کر لو بات............ بھئی محاورہ موقع محل دیکھ کر بولا جاتا ہے۔ اس میں ہندی یا انگریزی کی کیا بندش............''

گوربچن منہ بنا کر بولا۔

''لیکن اتنا کمزور............ چھی چھی چھی ......'' اُس کی حقارت کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے خود مہا گیانی ہو اور کہنا چاہتا ہو............ ہم چو من دیگرے نیست............''

ہنسی مذاق کی بات تلخ نوک جھونک میں بدل جاتی اگر دورجے بات کا رُخ نہ بدل دیتا۔ کہنے لگا۔

''بھئی آپ سب دیکھ لینا بھگوان نے چاہا تو ایک دن زوجیلا ٹنل ضرور بنے گا اور دو دن کا تھکا دینے والا طویل سفر ایک دن کی مسافت میں گھٹ کر رہ جائے گا............ کیوں اکرم صاحب آپ میری بات سے متفق ہیں............؟''

''جی ہاں ہمیں یہی اُمید کرنی چاہئے۔ اور یہ واقعی خوش آئند بات ہے...... فاصلے کم ہوں گے تو ہم پردیسیوں کی بے قراری بھی کم ہو گی......''

دورانِ گفتگو سڑک سے اسکول تک کا فاصلہ کیسے کٹا پتہ ہی نہ چلا............ اب ہم اسکول کے احاطے میں داخل ہوئے اور اُس جگہ جا پہنچے جہاں ہماری آمد کی خوشی میں اسکول عملے کے علاوہ دسویں جماعت کے طلباء و طالبات نے نمبردار اور گاؤں کی چند معتبر ہستیوں کو مہمان خصوصی کے طور پر جل پان کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہ ان حضرات کی محنتوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اسکول کی ایک دیرینہ مانگ ہماری شکل میں پوری ہو گئی تھی۔ ریاضی اور سائنسی نصاب کی تکمیل کے لئے تربیت یافتہ اساتذہ آن موجود ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھنے کے لئے بچوں کے والدین کے علاوہ گاؤں کا گاؤں جم غفیر کی صورت میں اسکول کے احاطے میں آن موجود تھا۔

سارے مہمان فرش پر بچھے عمدہ اور قیمتی قالینوں پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ ان کے

آگے دسترخوان کے بدلے، پست ٹانگوں والی چوبی میزوں پر پلیٹوں میں بسکٹ، سیب، مٹھائیاں اور خشک خوبانیاں جابجا رکھی ہوئی تھیں .... تھوڑی دیر بعد چھوٹی چھوٹی خوشنما پیالیوں میں چائے انڈیلی گئی...... چائے کا پہلا گھونٹ بھرنے کی شروعات ہم سے ہوئی۔ ہم نے کچھ تکلّف اور تامّل کے بعد برملا چسکیاں لینی شروع کیں...... اور پھر ہماری دیکھا دیکھی سبھی اپنی اپنی پیالیوں پر ٹوٹ پڑے۔ گویا سبھی ہمارے افتتاح کے منتظر تھے۔ کچھ دیر بعد بچوں کی جانب سے رقص و سرود پیش کیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے مزاحیہ ڈرامے ہوئے...... ناچ گانے کے دوران بھی مجمع کی نگاہیں ہم پر جمی رہیں۔ کیوں نہ رہتیں ...... ہم نو واردان کے لئے اجنبی جو ٹھہرے...... لیکن ہم مسرور تھے۔ سبھوں کا ملا جلا پرتپاک اور خلوص بھرا طریقہ استقبال ہمارے دلوں کو اتنا بھا گیا کہ اسی دم سے ہی اپنے آپ کو اس اجنبی گاؤں کا حصہ محسوس کرنے لگے۔

اخیر پر چند اساتذہ صاحبان، نمبردار اور ننھے مقرروں نے استقبالیہ تقریریں کیں۔ ہیڈ ماسٹر کی اختتامیہ تقریر کے ساتھ ہی سارے لوگ گھروں کو لوٹ گئے۔

جشن ذرا مختصر تھا۔ گھنٹے بھر بعد ہی اختتام پذیر ہوا۔ ہم بھی اُٹھے اور طلباء و اسکول اسٹاف کی رہنمائی میں کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گذر کر گاؤں کے اُس مکان میں جا پہنچے جس کے ایک کمرے میں مجھے اور میرے رفیق ساتھی کو دو سال کا طویل عرصہ گذارنا تھا............ گویا ہمیں کالے پانی کی سزا ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر دل دھک سے رہ گیا۔ دماغ پر ہتھوڑے سے پڑے۔ مگر ہمت جُٹانی پڑی۔ ہمارا سامان اس کمرے میں پہلے سے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔

کمرہ نہایت صاف اور نفیس تھا۔ ہمیں اس کمرے تک پہنچانے کے بعد بچّے اور اساتذہ رخصت ہوئے۔ اب صرف نمبردار اور ماسٹر غلام قادر موجود رہے۔ کچھ لمحے بعد نمبردار نے غلام قادر سے وہ چھوٹی سی بھیڑ جس کا انہوں نے خود انتظام کیا تھا ہمارے لئے ذبح کر کے میزبانی کی انتہا کر دی۔ یہی طریقہ تو لداخی قوم کو خلوص، نیک نیتی اور مہمان نوازی میں ہر لحاظ سے ممتاز اور اعلیٰ بنائے رکھنے کی ترجمانی تھی۔ ورنہ آج کے زمانے میں بھیڑ تو کیا مہمان کی خوشنودی کے

لئے چھوٹا سا مرغ دینا بھی بارِگراں گزرتا ہے۔ ہم اپنے محسن سے بے حد متاثر ہوئے وہ ہمارے احساسات نظر انداز کر کے ہم سے دست بدستہ مخاطب ہوا۔

"ماسٹر جی ......آپ تھک چکے ہوں گے جی۔ میں زیادہ رُک کر آپ کو کشٹ نہیں دینا چاہتا ہوں جی۔ اس لئے اجازت دو جی..........میرا نام ٹشی ہے جی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتو سنکوچ مت کرنا جی۔ ہم کو پیغام دینا جی۔.... سنکوچ بالکل مت کرنا جی......اچھا جولے ...... چلتا ہوں جی......جولے جی۔"

بات بات پر نمبردار کا جی جی کہنا مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس جی جی میں ہمارے تئیں بے پناہ احترام ...... بے پناہ عزت افزائی تھی ۔ایسا کہہ کر وہ اپنے بڑے پن کا ثبوت دے رہے تھے۔ یہی سچائی بھی تھی۔ ہم نے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت بہت شکریہ......آپ کو تکلیف ہوئی۔"

"نہیں ......تکلیف نہیں ہوئی جی .... یہ ہمارا فرض تھا جی ....ہم گاؤں کا مُکھیہ ہوں جی......اسی لئے یہ سب کرنا پڑتا ہے جی......ہم کو اچھا بھی لگتا ہے جی.......... اچھا جولے جی......" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا..........

میں تو یہی سمجھا تھا کہ میرے ابّا میری دل تسلّی کے لئے لداخ کے لوگوں کی مہمان نوازی اور سادگی کی تعریفیں یونہی کیا کرتے رہے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ اُن کی باتوں میں کتنا وزن تھا کتنی سچائی تھی ....میں حیران تھا کہ جاتے جاتے نمبردار یہ "جُولے" کیا کہہ گئے ہیں۔ بعد میں ماسٹر غلام قادر سے معلوم ہوا کہ جُولے بودھی زبان میں "سلام" کو کہتے ہیں۔

اس گاؤں میں شرع محمدیؐ کے مطابق بھیڑ ذبح کرنے والا غلام قادر کے سوا کوئی مُسلم نہ تھا اس لئے وہی بھیڑ ذبح کرنے کا فریضہ انجام دیتے تھے..........نمبردار کے جاتے ہی وہ بھی چلے گئے۔

باب سوم

موسم بہار کے ابتدائی دن تھے۔ پیڑ پودوں میں جان پڑ رہی تھی۔ شاخوں سے ننھے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ ندیوں کے کناروں پر نمی کی وجہ سے سبزہ زار کی مخملی پرت سی اُبھری تھی۔ خوشگوار ہوائیں چھوٹے بڑے پیڑ پودوں کو جُھلا جُھلا کر بہار کی آمد کا پیغام دے رہی تھیں......

شام کے چھ بجے ہوں گے۔

ہم دونوں کئی دنوں کی تھکاوٹ سے چُور ہونے کے باوجود کمرے میں ستانے کے بجائے ندی کے ساتھ ساتھ کھیتوں کے بیچوں بیچ خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے گاؤں کی سیر کو نکلے۔ راستے اور کھیتوں میں مرد وزن، چھوٹے بڑے جو بھی ملے جُھک کر لداخی زبان میں سلام بجا لائے .... گویا ہم مدرّس نہ ہوئے اس گاؤں کے راجے مہاراجے ہوئے۔ ہم بھی مؤدب انداز میں جوابات دیتے، رسمی کلمات کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کی خندہ پیشانی میں بناوٹ یا بیگانگی کی ذرا سی بھی جھلک نہ دِکھ رہی تھی۔ راستے میں کچھ لڑکے بھی گاؤں دکھانے ساتھ ہو لئے۔ جُھٹ پٹے کے وقت تک یہاں وہاں خوب ٹہلے۔

سورج پوری طرح پہاڑوں کے پیچھے اُتر گیا تو ہم ان لڑکوں کی رہنمائی میں اپنے ڈیرے پر لوٹ آئے۔

ماسٹر غلام قادر شام کے کھانے کا اہتمام کر چکا تھا۔ کمرے میں پکوان کی للچانے والی خوشبو پھیلی تھی۔ لڑکے ہمیں چھوڑ کر جولے (سلام) کہتے ہوئے رخصت ہوئے تو غلام قادر نے

مُسکرا کر ہمارا استقبال کیا۔ ماسٹر دور جے اُن کے ہمراہ تھے۔ مُسکراتے ہوئے بولے۔

"کیوں ماسٹر صاحبان............ دیکھ آئے ہمارا گاؤں۔؟"

"جی ہاں...... سرسری دیکھ لیا۔" اکرم نے جواب دینے میں پہل کی۔ پھر جُھک کر جوتوں کے تسمے کھولتا ہوا دوبارہ بولا۔ "بے حد خوبصورت گاؤں ہے۔ گھومنے میں بڑا مزا آیا۔"

میرے دل کی بات لبوں پر مچل گئی۔ میں بے اختیار بولا۔

"مزہ تو آنا ہی تھا۔ کیوں کہ جتنا خوبصورت گاؤں ہے اس سے بھی زیادہ سُندر ان لوگوں کے دل ہیں۔ ان کی معصومیت ہے۔ یہ صرف چہرے کے ہی بھولے نہیں دل کے بھی بھولے ہیں۔"

میرے بیان میں ذرا سی بھی بناوٹ نہ تھی۔ مجھے طور طریقے اور چال ڈھال سے جیسا معلوم ہوا تھا ویسا ہی بولا...... ماسٹر دور جے اپنے دیس کے لوگوں کی تعریفیں سُن کر مسرور ہوئے۔ یوں لگا جیسے فخر سے اُس کا سینہ پھولا جا رہا ہو۔ جوش میں آکر کہنے لگا۔

"زبان کی مٹھاس، جذبۂ میزبانی اور طرزِ معاشرت ہم لداخیوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہے۔ یہی تو ہمارے تہذیب وتمدن کی پہچان ہے۔ ہم لداخی لوگ...... بودھ ہوں، مسلم ہوں یا عیسائی، اپنی شائستگی اور سادگی سے ہی دنیا بھر میں پہچانے جاتے ہیں۔"

وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے جواب دیا۔

"ہماری بھی اس میں دو رائے نہیں۔ ہم آپ کی بات سے متفق ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاتب تقدیر نے یہاں پٹخ کر ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے...لیکن میرا خیال سراسر غلط نکلا............"

اکرم جوتے اُتار کر بیٹھ چکا تھا............ میں بھی تسمے کھول کر بیٹھ گیا...... بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ چاہتا تھا کہ جلدی سے کھا پی کر سو جاؤں تاکہ صبح تازہ دم اُٹھ سکوں...... کل سے سارے کام خود ہی نپٹانے تھے۔ جھاڑنا، پونچھنا، پکانا، دھونا، پانی ذخیرہ کرنا، اِن سب کاموں سے خود ہی نپٹنا تھا۔ اپنی اپنی بیویاں بچے تو سینکڑوں میل دُور اپنے اپنے آبائی گھروں میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ ساتھ ہوتے تو اِن باتوں کی فکر نہیں ہوتی ہمیں

نہیں ...... میں اسی سوچ میں گم تھا کہ ماسٹر غلام قادر ہمارے لئے کھانا پروسنے لگے...... ماسٹر دورجے نے اُٹھ کر ہاتھ دُھلوایا۔ غلام قادر نے کھانا پروس کر پلیٹیں ہمارے روبرو کیں...... اصرار کے باوجود وہ کھانے میں شریک نہ ہوئے۔ البتہ کھانے سے فارغ ہونے تک دونوں ہی میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آج ان کی جانب سے خاطر تواضع نہ ہوئی ہوتی تو بیوی بچوں کی یاد میں نوالے حلق میں ہی اٹک کر رہ جاتے........... اُنہوں نے باتوں میں اس قدر اُلجھائے رکھا کہ ہم کھاتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ طبیعت سیر ہوگئی۔

اس کے بعد برتن سمیٹے گئے۔ پتیلوں میں سبزیاں اور کھانا کافی مقدار میں بچا رہ گیا۔ جنہیں وہ وقتِ رخصت ہمارے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ کھانا اگلے دن ہمارے دوپہر کے کام آسکتا تھا...... وہ گئے تو ہم نے اپنی تھالیاں دھوڈالیں اور بستر ڈال کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

دُور آکاش پر بے شمار ستارے جگمگا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ کیا پتہ میرے بیوی بچوں کو بھی اس وقت آنگن سے آکاش کی وسعتوں میں ٹھیک انہی ستاروں پر نظر پڑ رہی ہو اور وہ ان میں سے کسی تارے کے ٹوٹ کر گرنے کی تاک میں ہوں تا کہ اُسے ٹوٹتے دیکھ کر فٹ سے میرے واپس لوٹنے کی منت مانگ سکیں۔ کہتے ہیں کہ ٹوٹتے تارے کو دیکھ کر یاد یکھتے ہوئے جو بھی خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے۔

میں کافی دیر تک کھڑکی کی سیدھ سے آکاش میں نظر آنے والے ستاروں کو دیکھ کر خیالوں کے تانے بانے بُنتا رہا.......... پھر کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پتہ ہی نہ چلا۔

باب چہارم

صبح کی پہلی کرن روشن دان کے شیشوں سے چھن کر میری آنکھوں پر پڑی۔ نیند کے باوجود آنکھوں میں تیز چمک اور اُجالا سا محسوس ہوا۔ دھوپ کی تپش نے بھی پریشان کر دیا۔ آنکھیں کھولنے کی دیر تھی کہ چندھیا کر پھڑ پھڑا اُٹھیں۔ دھوپ بچا کر ایک نظر اپنے ہم چشم کو دیکھا وہ اب بھی گہری نیند سویا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں ابھی اُس کی آنکھوں تک نہ پہنچ پائی تھیں۔ ورنہ شاید وہ بھی ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔

دُور ڈھولک اور جھانجھ کی تھاپ پر نفیری کی بلند آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ شاید مقامی بُدھ وہار (گونپہ) میں پوجا پاٹھ جاری تھا............

ایک بھرپور انگڑائی کے بعد میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ رفع حاجت کے بعد قریب کی ندی پر وضو کرنے چلا گیا۔ مدُھر سرگم میں بہتا پانی بالکل شیشے جیسا چمک رہا تھا۔ مگر اس میں بلا کی ٹھنڈک بھی موجود تھی۔ شاید قریب کے پہاڑوں سے تازہ برف پگھل پگھل کر اُتر رہی تھی۔

سورج کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کرتے پانی کو میرے ہاتھوں نے چھوا ہی تھا کہ جھٹکا سا لگا۔ میں نہ صرف اُچھل پڑا بلکہ بے ساختہ منہ سے چیخ بھی نکل گئی۔

"ارے باب رے باب۔ کتنا ٹھنڈا پانی ہے۔" میں نے خود کو کوس دیا۔ "یہ تُو کہاں آ کے پھنس گیا وسیم بیٹا............"

تبھی عقب سے بے اختیار سُریلی قہقہوں کی دلفریب آوازیں گونجیں۔ جیسے ایک ساتھ کئی پریاں کھلکھلا کر ہنس پڑی ہوں۔

مُڑ کے جو دیکھا تو دو حسین دوشیزائیں قہقہے چھپانے کی کوشش کرتی نظر آئیں......انہیں دیکھ کر میں نے کھسیانی صورت بنائی اور لاچاری سے کہا۔

"بب............بہت ٹھنڈا ہے تمہارے گاؤں کا پانی............"

"جی ماسٹر جی............" کہنے کے باوجود بھی دونوں ہنستی رہیں۔

پھر ان میں سے ایک دوشیزہ قہقہہ دباتی ہوئی بولی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ....سردیوں میں اس سے بھی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ جمے ہوئے کورے کے نیچے سے پانی لینا پڑتا ہے............ ایسے میں تب کیا کرو گے۔؟"

"تب۔تب............تب کیا کروں گا............!"

میں نے مسخروں کی سی مصنوعی اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تب نوکری چھوڑ کے نو دو گیارہ ہو جاؤں گا۔"

دونوں میری بات کا مطلب نہ سمجھے۔

تبھی پہلی والی نے دوبارہ پوچھا۔

نو دو گیارہ............؟ یہ نو دو گیارہ کیا ہے............؟"

"یعنی میں بھاگ جاؤں گا............"

ایسا کہتے ہی میانہ قد دوشیزہ کی ہنسی بڑھ گئی جب کہ پہلی والی نے ہنسی روک کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیسا ڈرپوک آدمی ہے ....ٹھنڈے پانی سے ڈرنے والا......چھی......کوئی سُن لے گا تو کیا کہے گا۔ ماسٹر جی ہم تو برفانی موسم کے بلا کی ٹھنڈ میں جمے پانی سے کپڑے برتن وغیرہ دھوتے رہتے ہیں............"

"اس میں تمہارے لئے بڑی کیا بات ہے......تم تو......کیا نام ہے تم دونوں کا......؟"

"چھورول ہے میرا نام......میں نمبردار کی بیٹی ہوں۔اور یہ ہے میری سہیلی یانسکت۔"

چھورول کے تعارف دینے کے بعد میں نے دوبارہ اپنی بات شروع کردی۔

"ہاں تو چھورول میں کہہ رہا تھا...........اس میں تمہارے لئے بڑی بات کیا ہے۔؟ تم دونوں تواسی ماحول کے پلے بڑھے ہو۔"

دونوں سہیلیاں اپنی ہنسی روک چکی تھیں۔میانہ قد کی یانسکت میری بات سے متفق نظر آئی۔وہ بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولنا جانتی تھی۔آواز دبا کر دھیرے سے بولی۔

"یہ تو ماسٹر جی نے بالکل صحیح بتایا ہے۔ہم کو جانور کا جیسا نہیں ہنسنا چاہیئے۔"

"ارے ناری یانسکت.........."

چھورول دوبارہ کھلکھلانے لگی۔وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں ماسٹر جی پانی کو چھوتے ہی کیسے اچھل پڑے تھے۔جیسے......کسی نے سوئی چبھا دی ہو۔مجھے تو ماسٹر جی کو اُچھلتے دیکھ کر ہنسی آئی...........میرا کیا قصور؟......خیر جانے دو۔"

اب چھورول نے نہ صرف ہنسی روک دی تھی بلکہ اُس کے معصوم سے سُرخ رخساروں پر سنجیدگی کے آثار بھی اُبھر آئے تھے۔

"ہم سے بھول ہوگئی..........ہمیں معاف کردو ماسٹر جی۔"

"ارے نہیں نہیں۔مجھے بُرا نہیں لگا...........تم دونوں کی زندہ دلی نے تو دل ودماغ کو تازگی بخش کر میری ہمت بڑھا دی ہے۔اب دیکھو میں پانی کو کیسے چھوتا ہوں۔"

چھورول ایک دم سے چیخ سی پڑی۔

"رُکیئے ماسٹر جی.........."

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"اب کیا بات ہے؟"

وہ ہمدردانہ لہجے میں جھٹ سے بولی۔

''آپ کہیں تو میں گھر سے پانی گرما کے لے آؤں......؟''

''ارے نہیں نہیں......کوئی ضرورت نہیں۔عادت پڑ جائے گی۔''

دوشیزاؤں کی دیکھا دیکھی اب جو خدا کا نام لے کر پانی کو دوبارہ چھوا تو یخ بستہ پانی سے انگلیوں کے کٹنے کا گمان ہوا۔سارے بدن میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔

دوشیزائیں جا چکی ہوتیں تو وضو کے لئے بھاگ کر اسٹوو پر ہی پانی گرما لیتا۔لیکن اُن کی موجودگی غیرت کو للکارنے کا ایسا باعث بنی کہ''مرتا کیا نہ کرتا کے مثل مجبور ہو کر یخ بستہ پانی سے جھٹ پٹ وضو کرنا شروع کر دیا۔

میری حالت زار دیکھ کر ریانسکت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''بے چارا۔''

چھورول اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھ بیٹھی۔

''ماسٹر جی......آپ کا شُبھ نام......؟

میں نے سر کا مسح کرنے کے بعد پاؤں دھوتے ہوئے جواب دیا۔

''وسیم............وسیم ہے میرا نام............اور میرے ساتھی کا نام اکرم ہے۔ہم دونوں کشمیر کے ہیں۔''نام جاننے کے بعد چھورول دوبارہ بولی۔

''ماسٹر جی............ابالے (ابا جی) نے دونوں کے لئے انڈے بھیجے ہیں آملیٹ بنانے کے لئے۔یہاں رکھتی ہوں گھاس میں۔''

''کیوں تکلیف کی نمبردار جی نے............''

میں نے اُسے انڈوں بھرا ایک میلا کچیلا چھوٹا سا سوتی تھیلا عقب کی لمبی گھاس میں رکھتے دیکھ کر کہا۔

''ہماری طرف سے شکریہ کہہ دینا۔''

''اچھا جی۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہنے کے لئے کہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ شکریہ۔ ضرورت پڑی تو کہلا بھجوا دوں گا''۔

دونوں دوشیزائیں لوٹ گئیں۔ پل بھر کے لئے میں اُن کی معصومیت میں کھو گیا۔ وہ دونوں کلی سے کھل کر گلاب ہونے کی حد کو پہنچ چکی تھیں۔ کنواریوں کا چوغہ جسے لداخ زبان میں ''فومیت'' کہتے ہیں زیب تن کئے لمبے بالوں کی موٹی سی لٹوں کو سانپوں کی طرح کولہوں پر جھلاتی دونوں کی متوالی چال بڑی دلفریب لگ رہی تھی۔ پہناوے میں بھی جدید دور کا اثر شامل تھا۔ کچھ آگے جا کر دونوں پیڑوں کے بیچ کھو گئیں۔

میری نماز قضا ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی وضو کر کے چلا آیا اور پروردگار کے حضور سر بہ سجود ہو گیا...... نماز سے فراغت پائی تو اسٹوو برتن اور پتیلے نکال کر قرینے سے رکھ دیئے۔ تیل خاکی اور اشیائے خوردنی کا انتظام لیہہ شہر سے ہی کر چلے تھے...... اب پہلا کام جو برقی سُرعت کیطرح میرے ذہن میں کوندا صبح کی بیڈ ٹی تھی۔

میں نے اسٹوو کی خالی ٹنکی میں تیل خاکی بھرنے کے بعد اسے جلایا اور دُھلے ہوئے پتیلے میں حسبِ ضرورت پانی ڈال کر اسٹوو پر چڑھا دیا۔ پانی اُبلتے ہی لپٹن چائے کی ضروریات اس میں ڈال دیں............ کچھ ہی دیر میں چائے بن کر تیار ہوئی تو اکرم کو جگا کر پیش کیا۔

اُس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کھولتے ہی اُس کی پہلی نظر دھوپ کی تیز کرنوں پر پڑی جو کمرے کو چکا چوند کئے ہوئے تھی۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر انگڑائی لیتا ہوا بُدبُدایا۔

''کئی دنوں کے مسلسل سفر سے ہونے والے تکان کا اثر ہے...... میں کافی دیر سویا رہا۔''

میں نے چائے کی پیالی تھماتے ہوئے جواب دیا۔

''میں بھی ابھی سویا ہی ہوتا لیکن سورج کی تیز کرنیں میری آنکھوں میں نشتر کی طرح اُتر گئی تھیں...... مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ مجبوراً جاگنا پڑا...... لو بیڈ ٹی پی لو فرش ہو جاؤ گے......''

اکرم نے شکریہ کہہ کر پیالہ پکڑا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس.........کم ان پلیز۔''

میں نے انگریزی میں کہہ کر دستک دینے والے کو آنے کی اجازت دے ڈالی۔

''جولے.........''

''السلام علیکم۔''

ماسٹر دور جے اور ماسٹر غلام قادر دونوں یکے بعد دیگرے رسمی سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ دور جے کے ہاتھ میں تازہ سبزی، تھوڑا سا دیسی مکھن اور کچھ پھولی ہوئی گرما گرم موٹی موٹی روٹیوں کے علاوہ چند انڈے بھی تھے۔

یعنی ہمارے ناشتے اور پہلے دن کی ترکاری کا بیشتر انتظام کر لائے تھے۔

انڈوں پر نظر پڑتے ہی مجھے نمبردار کے بھیجے ہوئے انڈے یاد آ گئے۔ اس کا مطلب تھا وہ اپنی ذمہ داریوں کے علاوہ میزبانی کے فرائض بخوبی نبھا رہا ہے...... کشمیر کے دیہاتوں اور گاؤں میں تبادلے کے دوران کبھی بھی ایسی میزبانی دیکھنے، سُننے کو نہ ملی تھی...... ایسے میں دور اُفتادہ کوہستان کے اجنبی میزبان کی ہم پردیسیوں کے تئیں بے مقصد میزبانی سے شاید ہی کوئی خودغرض متاثر نہ ہوتا۔

میں تو بہت متاثر ہوا۔

دور جے نے لائی ہوئی اشیاء کے لئے رکھنے کی جگہ ٹٹولتے ہوئے ہم سے خیریت پوچھی۔

''کہئے جناب.........رات کیسی گزری''

''آج کافی آرام کیا.........''

میں نے جواب دیتے ہوئے اُن کے لئے بھی پیالوں میں چائے انڈیلنا شروع کی۔

''بڑے مزے کی نیند آ گئی...... تھکاوٹ سے سارا بدن ٹوٹ پھوٹ سا گیا تھا۔ سارے پٹھے اکڑے ہوئے سے لگ رہے تھے......لیکن اب آرام ہے......''

دور جے چیزوں کو طاق پر رکھ چکا تھا۔

ذرا سی تکلّف کے بعد وہ ہماری بیڈٹی میں شامل ہو گئے۔

نئے دوستوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے بڑا اچھا لگا۔ اب وہ نہ صرف ہم پیشہ تھے بلکہ ہمارے خیر خواہ اور محسن بھی تھے۔

چائے کا دور ختم ہوتے ہی انہوں نے ہماری ضروریات کا بھرپور جائزہ لیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک پانے کے باوجود تاکید کی کہ کسی بھی چیز کی ضرورت پڑنے پر انہیں بلا تامل آگاہ کردیں...... یہ ان کی دریا دلی تھی۔

زمانہ قدیم میں اس دُور اُفتادہ پچھڑے خطے کے دیہاتوں میں جب جب کوئی دیسی پردیسی اجنبی شخص کسی بھی غرض سے وارِد ہو جاتا تو وہ ہر کسی کے لئے قابل تعظیم مہمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی عزت اس کا احترام اُس کی خاطر تواضع کرنے میں ہر چھوٹے بڑے کو فخر محسوس ہوتا۔ اُس کی ضروریات کا بھرپور خیال رکھا جاتا۔ وہ جب تک کسی گھر میں رہتا اُسے گھر کے باقی افراد کی طرح ہر قسم کی آزادی ہوتی۔ اپنے میزبان کی بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کر لیتا تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ بلکہ سادگی اتنی کہ مہمان کی خوشی میں بھگوان کی مرضی جان کر مطمئن ہو جاتے۔

تب زمانے کے دریا دل لوگوں کی سادگی ایسی تھی کہ چوپال میسر ہونے کے باوجود اجنبی کو گھر میں پناہ دی جاتی...... تب سے جانے کتنی نسلیں گزری ہونگی لیکن یہ طرزِ معاشرت وقت کے ساتھ ساتھ نئی نسلوں میں منتقل ہوتی رہی۔ اور آج بھی چند اِکے دُکّے معیوب رواجوں کو چھوڑ کر باقی سارے رواج نئی نسل میں بدرجہ اُتم موجود ہیں...... یہی وجہ تھی کہ دور جے اور اکرم ہمارا اس قدر خیال رکھ رہے تھے۔

دونوں واپس جانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ جانے سے پہلے دور جے بولا۔

"دوپہر کا انتظام تو آپ کے لئے ہو چُکا...... اب صرف آج شام سے پکانے کی زحمت کرنا پڑے گی......"

"ہاں دور جے صاحب"۔ اب کی بار اکرم کے ہونٹ ملے۔ "دن کے لئے کل کا بچا بہت

پڑا ہے۔اس سے گزر ہو جائے گا......شام ہونے میں تو ابھی سارا دن باقی ہے۔آپ دونوں کی ہمدردی اور خیال رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔"

دور جے مُسکرا دیا۔بولا۔

"بس یہ شروع کے چند دن ہی پریشان کُن ہوتے ہیں۔اس دوران خیال رکھنا ہمارا فرض ہے......حالات سے سمجھوتہ ہو جانے کے بعد کسی کی مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی......"

"جی ہاں۔آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اکرم جواب میں بولا۔"ویسے بھی جہاں آپ جیسے بھلے لوگ موجود ہوں وہاں بھلا کس بات کی پریشانی......"

دور جے مُسکرا دیا۔قادر کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسُم بکھر گیا۔

"اچھا اب اجازت دیں۔ہم چلتے ہیں۔" دونوں "جو لے۔سلام" کہہ کر دروازے کی جانب مُڑے اور چلتے بنے۔

صبح کے سات بجے ہونگے۔بیڈ ٹی کے بعد اکرم ٹوتھ پیسٹ تولیہ صابن لے کر ندی پر چلا گیا۔میں نے باقاعدہ ناشتے کی خاطر اسٹو پر نمکین چائے چڑھا دی۔

ابھی اسکول روانہ ہونے میں پورے تین گھنٹے باقی تھے۔

باب پنجم

کوہستانی سلسلے کے اس چھوٹے سے ہائی اسکول میں آج ہماری ڈیوٹی کی ابتدا ہونے جا رہی تھی۔ ہم ہر لحاظ سے تیار تھے...... حالانکہ یہاں کی تہذیب، بولی اور ثقافت کے اعتبار سے درس وتدریس کے معاملے میں تجربے کے نئے مرحلوں سے گزرنے کا ہمیں پورا احساس تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تو حسب عادت وقت کی پابندی کے خیال سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی اسکول کی جانب چلدیئے۔ تاکہ خراماں خراماں چل کر آس پاس کے نظارے کا بھی جی بھر کر لُطف لیا جاسکے۔

ہمارے ڈیرے سے اسکول تک ایک پگڈنڈی ندی کے ساتھ ساتھ جاتی تھی جو کہیں درختوں کے جھنڈ میں کہیں کھیتوں اور کہیں گارے کی اینٹوں سے بنے سپارٹ چھتوں والے دو منزلہ مکانوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھی۔

پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جہاں کہیں بھی ان مکانوں کے سامنے سے گزرے...... صحن میں بندھے پست نسل کے چاق وچوبند کتوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ ان کے بھونکتے ہی مکانوں کے دریچے اور جدید طرز کی چھوٹی بڑی کھڑکیاں ادھر اُدھر سے کھلیں ...... مرد وزن، جوان بوڑھے ہر کسی نے اپنی اپنی کھڑکیوں میں سے جھانک کر دیکھنے اور جاننے کی کوشش کی...... نگاہیں چار ہوتے ہی وہ ہمیں پہچان گئے۔

دوسرے ہی پل کتوں کو خاموش کرانے کی ڈانٹ پھٹکار شروع ہوئی...... کتے خاموش ہو

کر کونوں میں دُبک گئے تو جان میں جان آ گئی......

ہماری گھبراہٹ چھپائے نہ چھپتی تھی ......واقعی کتّوں کی ہڑ بونگ سے دل حلق تک اُچھلا تھا۔نس نس میں کرنٹ سی دوڑ گئی تھی۔

کھڑکیوں میں سے جھانکنے والوں نے ہونٹوں پر تبسّم بکھیر کر ہمارا استقبال کیا۔

''جُو لے جی......

''جُو لے جی......جُو لے جی......جُو لے جی......جُو لے......''

جُو لے یعنی 'سلام' کی مردانہ وزنانہ مترنم آوازیں کانوں میں بوچھاڑ کی طرح پڑ گئیں۔ جو بہت بھلی معلوم ہوئی۔

ہم نے لیڈروں کی طرح ہر کھلی کھڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر ان کے سلام کا جواب ان ہی کے طرز پر دیا۔

''جُو لے جی۔جُو لے جی۔جُو لے جی۔آپ کو بھی جُو لے۔جُو لے......''

ہمارے جُو لے کا جواب دینے کے بعد وہ آپس میں باتیں کرنے لگے......شاید بے خبروں کو لداخی بولی میں ہم سے متعلق جانکاری دے رہے تھے......اس بات کو یونہی مجھے اپنے بل پر قیاس کرنا پڑا......

ذرا آگے چلے تو پگڈنڈی ندی کے ہمراہ کھلے کھیتوں میں اُتر گئی......اب تو پگڈنڈی کے دونوں جانب کھیتوں میں ہلچل نظر آئی......مرد عورتیں' بوڑھے اور جوان یہاں تک کہ بچے بھی اپنے اپنے کھیتوں کے لئے گدھوں کی قطاروں پر گھریلو سڑے ہوئے فضلے یعنی دیسی کھاد ڈھو رہے تھے......یہ فضلے یا کھاد ان کی اپنی بیت الخلاؤں اور مویشی خانوں کے تھے اور جو لوگ قبل از وقت ڈھلائی کا کام مکمل کر چکے تھے وہ بہار کی آمد سے متعلق پُر سُرور گیت گاتے ہوئے بیلچوں اور پھاوڑوں کی مدد سے کھاد کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں کو کھیتوں پر اِدھر اُدھر بکھیر رہے تھے۔جو لوگ بکھیرنے کا کام مکمل کر چکے تھے وہ بیلوں کو لُبھانے اور منانے والے لوک گیت

گنگناتے ہوئے ہل جوتنے میں مصروف تھے۔

اس سارے منظر میں نمبردار کی بیٹی چھورول اوراس کی سہیلی یانسکِت بھی دوسروں کی طرح کھاد کی بڑے سے ڈھیر کے سامنے متحرک نظر آئیں۔ان کی پیٹھ پر پتلی ٹہنیوں سے بنی بڑی چوکور ٹوکریوں میں ایک تیسری ہمجولی دوشیزہ بیلچے بھر بھر کر کھاد ڈالے جا رہی تھی۔

ہماری پگڈنڈی اُن کے کھیتوں میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ہم جہاں جہاں سے گزرے کام کرنے والے ہماری جانب متوجہ ہوتے گئے۔قریب والوں نے "جُو لے" کہہ کر سلام بجا لایا اور دُور والے مُسکرا کر خوش آمدید کا اظہار کر گئے۔

چلتے چلتے پگڈنڈی نمبردار کے کھیتوں کو چھوئی ہی تھی کہ دوشیزاؤں کی نگاہیں ہم پر پڑیں......مٹّی میں لت پت اُن کا حُلیہ بہاری مزدوروں سے کم نہ تھا......ہمیں دیکھ کر شرما گئیں......سیبوں جیسے رخسار حیا کے مارے اور بھی گُلال ہوگئے۔

دونوں کو ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرتے دیکھ کر میں نے بلند آواز میں کہا۔

"اے چھورل......کام میں شرم کیسی......ہم تو خود اپنے گاؤں میں سروں پر ٹوکرے اُٹھایا کرتے ہیں......کھاد ڈھوتے ہیں......بیلوں کی مدد سے کھیتوں کی جوتائی کیا کرتے ہیں......بلکہ پکنے پر فصل کی کٹائی، خوشوں کی دھنائی اور پیٹھ پر اناج کی گھر تک ڈھلائی وغیرہ سب کام بڑی محنت، جوش اور لگن سے کیا کرتے ہیں۔کیوں اکرم سچ ہے نا......؟"

اکرم میری بے باکی اور دوشیزاؤں کی ردِ عمل پر حیران ہوگیا۔میری باتوں سے دوشیزاؤں کی ڈھارس بندھ گئی تو چھپنا چھپانا ذرا کم ہوا۔لیکن مُسکرانے کی ادا کے ساتھ نخرے کرتے ملنے جُلنے، نظریں چُرانے ملانے کا عمل آنکھ مچولی کی طرح جاری رہا۔

اکرم نے ٹہوکا دے کر کانا پُھوسی کی۔

"کیا کرتے ہو وسیم......نہ جان نہ پہچان......تم ایسے مخاطب ہو جیسے برسوں کی پہچان ہے۔دیکھنے والے کیا سوچتے ہونگے......"

''بھائی میرے۔ صبح جن دولڑکیوں کا ذکر کیا تھا......یہی تو ہیں وہ......ان میں سے وہ لمبی میرون رنگ کی چوغے والی نمبردار کی بیٹی چھورول ہے۔ وہی تو انڈے لے آئی تھی۔ اور وہ میانہ قد کی کالی چوغے والی اُس کی سہیلی یانسکت ہے۔ دونوں بے حد خوش مزاج اور زندہ دل ہیں۔''

پھر دوشیزاؤں کو مُسکراتے دیکھ کر میں نے دوبارہ آواز دی۔

''ڈیوٹی پر جانا نہ ہوتا تو ہاتھ بٹانے چلا آتا......اے چھورول۔ نمبردار سے شکریہ کہہ دیا تھا نا......؟''

''جی ماسٹر جی...... کہہ دیا تھا۔''

''بہت خوب اب کام کرتی جاؤ......ہم چلتے ہیں۔''

''اچھا جی......جُولے''۔

''آپ کو بھی جُولے......'' ہم اپنی راہ چل پڑے۔

جا بجا ایک میلہ سا لگا تھا...... ہر طرف گہما گہمی یعنی جنگل میں منگل کا سماں ......نِکھری نکھری دھوپ میں سب کچھ بے حد خوشگوار لگ رہا تھا۔

اسکول تک پہنچتے پہنچتے ہمارے پیچھے پاس پڑوس سے آنے والے طالب علموں کا قافلہ سا بن گیا۔

ابھی ہمارے قدم احاطے میں پڑے ہی تھے کہ گھنٹی بج اُٹھی ...... گھنٹی کا بجنا تھا کہ عقب میں چلنے والے بچوں میں افراتفری مچ گئی۔ سبھی ہمیں جُولے کہتے ہوئے دوڑ کر آگے نکل گئے...... آن کی آن صحن میں صبح کی دُعائیہ کے لئے قطاریں بندھ گئیں......

ہیڈ ماسٹر صاحب اور دیگر اساتذہ کرام دفتر میں پہلے سے ہی آن موجود تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر گرمجوشی سے استقبال کیا...... ہم نے جوئننگ (Joining) رپورٹ پیش کی اور باقاعدہ اسکول کے اسٹاف ممبر بن گئے۔

صحن میں شاگردوں کی دِلآویز دعائیہ شروع ہوگئی۔ طلباء و طالبات آنکھیں موندھے

دونوں ہاتھ جوڑے بودھی زبان میں اپنے پرمیشور سے روشن مستقبل کی دعائیں مانگنے لگے۔ اپنے گاؤں اور دیس کے لوگوں کی حفاظت ترقی اور بھائی چارا کی کامنائیں کرنے لگے...... یہ سلسلہ لگ بھگ بیس منٹ تک چلا۔

دعائیہ ختم ہوگئی۔

بچوں کو ایڑیوں پر بیٹھنے کا حکم ہوا......

حکم کی تعمیل ہوئی......سبھی ادب سے بیٹھ گئے۔

حسب دستور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ادب تمیز محنت، ربط وضبط بھائی چارا اور وقت کی پابندی کے اصول پر زور دیا......اُن کی تقریر ختم ہوئی تو اکرم صاحب کو موقع دیا گیا۔

اکرم صاحب بچوں کے روبرو آ کر بولنے لگے تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ وہ پہلے بھی نئی نئی تقرری پر لداخ کے کسی گاؤں میں بحیثیت مُدرس دو سال تک اپنے فرائض انجام دے چکے ہیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔

''......اور جب لداخ میں تین سال کی طویل مُدت مکمل ہونے پر وادی کشمیر کے لئے میرا تبادلہ ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی تھی ..... گھر لوٹنے کی خوشی کسے نہیں ہوتی ......لیکن لداخ کے لوگوں کی سادگی، معصومیت، شرافت، مہمان نوازی خاص کر مذہبی رواداری اور انسانیت نے میرے دل ودماغ پر ایسا چھاپ چھوڑ رکھا تھا کہ جاتے جاتے میں نے مصمم تہیہ کر لیا کہ کبھی نہ کبھی پھر سے اپنے فرائض نبھانے اس پچھڑے خطے میں ضرور لوٹ آؤں گا...... خدا نے میری سُن لی ...... آج میں دوبارہ لداخ کی گود میں وارد ہوں ۔ آج پھر مجھے یہاں کی تہذیب میں رہ کر اپنے فرائض نبھانے کا نادر موقع ملا ہے۔ یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے اور انشاءاللہ میں اس میں کبھی بھی کسی قسم کی کوتاہی نہ برتوں گا...... شکریہ۔''

اکرم تقریر سے فارغ ہوا تو تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے سارا ماحول گونج اُٹھا۔ پھر مجھ سے اپنے خیالات اور تاثرات اظہار کرنے کی گزارش کی گئی۔

میں نے کہنا شروع کیا۔

"محترم ہیڈ ماسٹر صاحب، اساتذہ کرام اور پیارے بچو!...... میرا نام وسیم ہے...... میرا تبادلہ کشمیر سے پہلی بار ہوا ہے...... یہاں کا سارا ماحول میرے لئے اجنبی ہے۔ لیکن اپنے پیشے کے لحاظ سے یہ اجنبیت میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میرا کام میرا فرض آپ کو پڑھا لکھا کر سماج میں سر اُٹھا کر جینے کے لائق بنانا ہے۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ...... اکرم صاحب نے لداخ کے لوگوں کے بارے میں جتنی بھی تعریفیں کیں اس کی صداقت کا اندازہ کل کے بے مثال سواگت سے کر چکا ہوں۔ ہم دونوں کل کے پر جوش سواگت کے لئے ایک بار پھر آپ سبھوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں...... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنی محنت اور لگن سے آپ کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا جی جان سے کرلوں گا لیکن اس کے لئے آپ سبھوں کا تعاون ضروری ہے۔ آپ کو ہماری ہدایتوں پر عمل کرنا ہوگا۔ ہماری نصیحتوں پر توجہ دینی ہوگی۔ پڑھائی میں خوب دل لگانا ہوگا...... تبھی آپ بہتر اور روشن مستقبل کی ضمانت بن پائیں گے...... تبھی کامیابی آپ کے قدم چومے گی...... تبھی آپ سماج میں اونچا مقام حاصل کرنے کے اہل ہونگے۔ ہماری کوششیں آپ بچوں کی محنت سے ہی بہتر انجام کو پہنچ سکتی ہیں...... مجھے اُمید ہے آپ سب اپنی پڑھائی میں خوب مگن رہ کر اپنے والدین کے سپنوں کو پورا کر پاؤ گے۔ ہم سبھوں کی نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں...... شکریہ"

میں نے تقریر ختم کردی۔

ایک بار پھر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے سارا ماحول گونج اُٹھا۔

اس کے بعد بچے قطاروں میں کلاسوں کو چلے گئے۔

ہم دونوں کو اپنا اپنا ٹائم ٹیبل بتا دیا گیا۔

پہلے پیرڈ کے بجتے ہی ہم بھی اپنی اپنی کلاسوں کو چلے گئے۔

باب چھٹا

چار بج چکے تھے۔ نیلا آسمان دن کے تیسرے پہر بھی خوشگوار موسم کی گواہی دے رہا تھا۔ کھاد کے کئی بڑے بڑے ڈھیر نمبردار کے کھیتوں میں چھوٹے ڈھیروں کی شکلوں میں جا بجا ڈالے جا چکے تھے۔ اب اُس کا کل پریوار قبیلے کے چند مرد و زنوں کے ہمراہ شدومد کے ساتھ ان ڈھیروں کو اِدھر اُدھر بکھیرنے میں مصروف تھا۔ اس کام میں چھورول کی ہم جولی بھی اُن کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔

محنت کشوں کے ٹولے کام کے ساتھ ساتھ بہار کی آمد کے گنوں والے لوگ گیت جھوم جھوم کر گُنگناتے ہوئے ایک دوسرے کا جوش بڑھائے جا رہے تھے۔ ہر سو دلکش اور سہانا سماں بندھا تھا۔ کام میں مصروف سہیلیوں کی نوک جھونک اور ہنسی مذاق سے فضاؤں میں قہقہوں کی ترنگیں بکھرتا رہا۔ اِن ترنگوں سے اُن کی تھکان مٹتی رہی۔ وقت کی طوالت کا احساس بھی کم ہوتا گیا......

"سچ کہتی ہوں چھورول۔"

یانسکت مسکراتی ہوئی لداخی زبان میں بولی۔

''شہر کے بانکے سجیلے نوجوان مجھے بہت اچھے لگتے ہیں...... سُلجھے بال،شفاف پہناوے......
چمکتے جوتے اور مست چال......اتنا دل کو بھاتا ہے کہ بس......مچل جاتی ہوں............''

وہ چُپ ہوئی تو چھورول شوخی بھری اداؤں سے......''سچی......نا......میری قسم......'' کہہ کر چھیڑنے کے انداز میں پوچھنے لگی۔''اور کیا کیا اچھا لگتا ہے۔بتاؤ بتاؤ......بتاؤ بتاؤ......ہم بھی جانیں......''

یانسکت دلچسپ انداز بنانے لگی۔

''ا......و......ر......اور لمبی سی بڑی ناک......لم م مبا گندمی چہرہ......صا آ حبانہ چال......
او۔و۔ر......او۔و۔ر......''

ہم جولیاں اُس کی مسخری اداؤں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ہنس ہنس کر چھورول کے پیٹ میں بھی بل پڑ گئے......وہ پیٹ پکڑے ٹوکنے لگی۔

''اری رہنے دے رہنے دے......بہت ہے......بس بس بہت ہے۔''

''ابھی پوری کہاں ہوئی ری......''

وہ دائیں کلائی نازوادا کے ساتھ گھماتی ہوئی بولی۔''

''ابھی تو......وغیرہ......وغیرہ......وغیرہ باقی ہے............''

''بس بس......بہت ہوگیا......ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے......اب اور ہنسا نہیں جاتا......''

''اچھا......کیا واقعی۔؟'' یانسکت دیدیں نچانے لگی۔پھر جھٹ سے بولی۔''جیسی تمہاری مرضی......میں نے تو سوچا تھا......کہ باقی باتیں بھی...... خیر جانے دو......تمہارا دل کمزور ہے......تم برداشت نہیں کر پاؤ گی............''

اب جو اُس نے مسخری ادا کے ساتھ بات ختم کر دی تو نہ چاہتی ہوئی بھی چھورول اور ہم جولیاں دیر تک ہنستی رہیں......اور جب شانت ہو گئیں تو چھورول کہنے لگی۔

''مذاق اپنی جگہ یانسکت ......ویسے بھی اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ کاشمیر کے لوگ ناک نقشے اور خدوخال کے اعتبار سے ہماری نسبت زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں......سچ پوچھو تو ہماری چھوٹی سی ناک جُھری دار باریک آنکھیں اور متوسط قد یہاں تک کہ بے ڈھنگے لمبے پہناوے یعنی چوغے، فومیت اور سُلما وغیرہ بھی ہمیں باہر کے لوگوں میں کم تر بناتی ہوں گی......''

''ارے نہیں ری چھورول......کمتر کیوں بناتی ہوں گی......میں تو خود کو کسی سے بالکل بھی کم نہیں سمجھتی ......نسلی اعتبار سے جیسی ہوں بہتر ہوں......مجھے یا تم سبھوں کو کشمیر تھوڑے نا جانا ہے......اپنی تو علاقے کے اعتبار سے ناک نقشہ یہی ہونی چاہیے......آخر بھگوان کی دین ہے۔ہم نے تم نے تھوڑی نا بنائی ہے......بھئی میں جیسی ہوں خوش ہوں تم چاہو تو اپنا نقشہ بدلا دو......ناک نقشے کی مسخری تو میں نے یونہی کی تھی اور تم سنجیدہ ہو گئی......کہیں ماسٹر جی پہ دل تو نہیں آ گیا......؟''

''کیا اناپ شناپ بکتی ہے۔''

چھورول نے ٹوک دیا تو وہ منجھی ہوئی کھلاڑی کی طرح بولی۔

''نہیں بھئی......کیا پتہ......دل تو دل ہے......نادان ہے ناسمجھ ہے......کچھ بھی ہو سکتا ہے......پر کہے دیتی ہوں۔ستاروں کی تمنا کی جا سکتی ہے۔حاصل نہیں کیا جا سکتا......دہکتے انگارے بھی دمکتے ہیں......انہیں دور سے دیکھنا ہی بھلا لگتا ہے۔چُھونے سے ہاتھ جھلس جاتے ہیں......ہاں......سمجھ لو......جب کہتی ہوں تو دور کی کہتی ہوں......لو......آ گئے وہ دونوں بھی......ہو گئی تمہاری چُھٹی......''

یانسکت نے ہمیں طلبہ اور ماسٹروں کے ہمراہ اسکول سے لوٹتے دیکھ لیا تھا۔ہمارے درمیان لاما جی، ماسٹر دورجے اور ماسٹر غلام قادر بھی تھے۔ہم سبھی پگڈنڈی پر سے لوٹ رہے تھے۔

چھورول اور اس کی ہم جولیاں ہماری طرف دیکھ رہی تھیں......یانسکت کے ہونٹ ہل

رہے تھے۔شاید وہ چھورول سے کچھ کہے جا رہی تھی۔

"اے چھورول............ ماننے والی بات ہے ری۔"

"کیا ماننے والی بات ہے............؟"

چھورول جاننے کے لئے مچل گئی تو یانسکت نے ادا کے ساتھ جواب دیا۔

وہ جو سارے ماسٹر صاحبان آرہے ہیں نا۔اُن سب میں واقعی دونوں کاشمیری ماسٹر بالکل الگ...... بلکہ...... پُرکشش لگ رہے ہیں۔"

"لو۔ہوگئی لٹو............ اوروں کو نصیحت خود میاں فضیحت اسی کو کہتے ہیں.........."

یانسکت گھبرا گئی۔

"ارے نا بابا نا...... کوئی غلط مطلب نہ لینا۔میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی۔"

"ہاں ہاں...... کیوں نہیں...... میں کہتی ہوں تو بال کی کھال اُتار لیتی ہو۔اور تم کہو تو یونہی

یہ یونہی سے کیا مطلب ہے تمہارا......؟"

"خالص مذاق...... اور کچھ نہیں چھورول۔"

"تو میں کون سا سچ کہہ رہی تھی...... میں بھی تو دل بہلائی کے لئے ہی مذاق کر رہی تھی"۔

یانسکت نوک جھونک میں سنجیدہ ہوگئی۔کہنے لگی۔

"دل بہلائی کے باتوں میں کتنا مزا آتا ہے...... ہے نا۔"

"مذاق بہت ہوگیا...... اب چپ بھی ہو جاؤ...... وہ سب قریب پہنچ رہے ہیں۔"

چھورول اُسے ٹوک کر کام میں جُٹ گئی۔یانسکت اور دوسری سہیلیاں پھاوڑے چلانے لگیں۔

ہم سبھی نمبردار کے کھیت کنارے پہنچے تو ملی جلی آواز کے ساتھ جُولے 'سلام' کا لین دین ہوا۔نمبردار نے خندہ پیشانی سے آؤ بھگت کی۔پھر خلوص کے ساتھ گفتگو کی شروعات

ہوئی۔

"آ گئے ماسٹر جی۔ بچّہ لوگوں نے خوب پریشان کیا ہوگا۔ بہت شرارتی بچّہ لوگ ہے۔"

"نہیں......ایسی کوئی بات نہیں ......" اکرم نے ہنس کر جواب دیا۔" بچے ٹھیک ہیں......... سمجھانے سے سمجھ جائیں گے۔"

ماسٹر دورجے خوشگوار لہجے میں گویا ہوئے۔

"ابھی پہلا ہی دن تھا اکرم صاحب..........اسی لئے بچے دُبکے رہے ہیں۔ چند دنوں میں کھل جائیں تو آپ کا اندازہ بدل جائے گا..........پھر آپ جان جائیں گے کہ وہ کتنے شرافت پسند ہیں۔"

غلام قادر اور لاما جی اُن کی باتیں سُن سُن کر محظوظ ہوتے اور مسکراتے رہے۔ مگر چُپ رہے۔ کچھ بھی نہ بولے۔

ماسٹر دورجے کہہ رہا تھا۔

"..........انہیں ڈھیل کبھی نہ دیجئے گا۔ تبھی قابو میں رہیں گے۔"

میں نے نمبردار سے مخاطب ہو کر دھیرے سے کہا۔

"ہم سمجھتے ہیں اس بات کو......اب تو نوکری کرتے ہوئے کافی مدت ہوگئی ہے......آپ سے بس اتنا کہہ دوں......ہم بچوں کے اُستاد بھی ہیں اور ان کے شرارتی امراض کی دوا بھی......"

"جی ماسٹر جی.........." نمبردار نے تائید کرتے ہوئے کہا۔" آپ دونوں تو سمجھدار ہیں جی......ہم کو اور ہمارے گاؤں والوں کو آپ دونوں کے آنے سے بہت خوشی ہوگیا جی۔"

"شکریہ شکریہ.........."

اکرم اور میرے منہ سے ایک ساتھ تشکّر کے الفاظ نکلے۔

اب ہم نے چلنا ہی چاہا تھا کہ نمبردار نے بھی گھر لوٹنے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔" چلو ماسٹر صاحب ہم بھی چلتا ہوں۔"

"ہاں جی۔ آیئے آیئے۔" اکرم نے ایک طرف ہٹ کر نمبردار کو راستہ دے دیا پھر کھیتوں کا سرسری جائیزہ لیتے ہوئے کہا۔"اب تو لگ بھگ کام ختم ہو چکا ہے شاید.........."

"جی ماسٹر جی۔ صرف تھوڑا بچا ہے۔ ہمارا بچہ لوگ آدھا گھنٹہ میں ختم کردوں گا.........."

"ہمیں سمجھانے کے بعد وہ بیٹی کی طرف پلٹا اور ہولے ہولے چلتے ہوئے مُڑ مُڑ کر لداخی بولی میں ہدایتیں دینے لگا۔

"اے چھورول۔ میں گھر جارہا ہوں۔ ذرا سنبھال لینا اور کام ختم کر کے سیدھی چلی آنا۔ ان لڑکیوں کو بھی ساتھ لیتی آنا۔ سمجھی نا۔"

"جی ابالے۔" چھورول نے خندہ روئی سے جواب دیا۔

"اور ہاں۔ کوئی سامان چھوڑنا نہیں۔ سارے اوزار گن کر سمیٹ لینا۔"

"جی ابالے۔" چھورول نے دوبارہ مختصر سا جواب دیا۔"

"خیال رکھنا۔ گدھے چرتے چرتے کہیں دور نہ نکل جائیں......اور لوٹتے وقت سارے گدھوں کو بھی سمیٹ لانا۔ سمجھی کہ نہیں سمجھی۔"

"ہاں ہاں سمجھی ابالے۔ آپ فکر نہ کریں۔ سب کا دھیان رکھوں گی۔"

نمبردار کی ہدایتیں ختم ہوئیں۔ ہم دھیرے دھیرے چلتے رہے۔

آغوشِ فطرت میں پلنے والے لاتعداد کبوتروں کا ایک غول پہاڑی پر واقع بدھ وہار کی چھت سے اُڑان بھر کر پورے گاؤں کے گرد چکریں لگا رہا تھا۔ دوسرا غول سجے سنورے کھیتوں میں بیجوں کے بچے کھچے دانے چگنے میں مصروف تھا۔

ہمارے ڈیرے کے بالکل سامنے پگڈنڈی دو حصّوں میں بٹ کر اس طرح دو مختلف سمتوں کو چلا گیا تھا کہ ایک حصّہ ناک کی سیدھ میں آگے جا کر بکھری ہوئی بستی کے رستے سے جا ملتا تھا اور دوسرا بدھ وہار کے دامن میں بسے بستی کی طرف مُڑ کر گاؤں کے بیچوں بیچ گھومتا گھامتا اوپر بدھ وہار کی پہاڑی تک چلا گیا تھا۔

ڈیرے کے پاس پہنچتے ہی ہم سے رخصت لے کرلا ما جی اور کچھ بچے بدھ وہار کی پگڈنڈی پر مُڑ گئے۔ جب کہ نمبردار، دور جے، غلام قادر اور باقی بچے ناک کی سیدھ میں چلتے گئے۔

اکرم ڈیرے کا تالا کھول کر اندر چلا گیا اور میں ندی پر ہاتھ منہ دھونے بیٹھ گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر میٹھے پانی کے چند گھونٹ پی لئے۔ اتنے ٹھنڈے اور صاف وشفاف پانی کو دیکھ کر شہر کے میزل واٹر mineral water کی یاد تازہ ہوگئی جو پلاسٹک کی بند بوتلوں میں Seal سیل ہو کر دس روپے کے دام عام بکا کرتی تھی۔ وہاں شہروں میں میٹھا پانی (mineral) واٹر کے نام پر بوتل بوتل بکا کرتی تھی۔ اور یہاں ندی نالے تو کیا دریا اور جھیلیں بھی ہر جاندار کے لئے رب کائنات کی جانب سے مُفت اور کُھلے عام دستیاب تھا۔ انسانی فطرت سے جھنجھلا کر میں نے پانی کے دو چار چھپا کے منہ پر مارے اور جھٹ سے کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔

دُور نیچے کھیتوں میں کسان اب بھی مصروف عمل تھے۔ انہیں دیکھ کر طبیعت سیر ہوگئی۔ پھر اُس جگہ نگاہ دوڑائی جہاں نمبردار کی بیٹی اور لڑکیاں سرگرم تھیں اب وہ کام ختم کر کے اوزار و اسباب سمیٹنے میں جُتی تھیں۔

تبھی اُن کے درمیان اسکول بیگ اُٹھائے ایک لڑکا نمودار ہوا جو قریب پہنچ کر اوٹ پٹانگ حرکتوں سے اُنہیں بار بار ستانے لگا۔ یہاں تک کہ لڑکیاں پریشان ہو کر اُسے دبوچنے یا بھگانے کے لئے بھاگم بھاگ کرنے لگیں۔

میرے لئے یہ سارا معاملہ تفریح کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے محظوظ ہوتا رہا۔

ساری لڑکیاں اُس پر حاوی ہونے لگیں تو وہ چند جستوں میں جہاں سے آیا تھا وہیں کو ایک ایسے کشادہ اور دیوار نما لمبے سے مانے کے عقب میں غائب ہوگیا۔ جس کی چھت پر زمانہ قدیم کے کندہ کئے ہوئے چھوٹے بڑے بے شمار پوتر کتبے بکھرے پڑے تھے۔

اُس لڑکے کے روپوش ہوتے ہی میری دلچسپی ختم ہوگئی۔

اب دوشیزائیں سامان سمیٹنے کے بعد گدھوں کو سمیٹنے میں لگی تھیں۔

گدھے سمیٹے گئے تو چند گدھوں پر ٹوکرے لادے گئے۔ چند پر پھاوڑے اور بلیچے ڈالے گئے اور چند پر وہ خود سوار ہو گئیں۔

گدھوں کا ایک قافلہ سا سیدھی قطار میں پگڈنڈی پر چل نکلا۔ چھورول سالار قافلہ کی طرح آگے چلنے کے بجائے سب سے پیچھے رہی۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ لڑکا بودھی مانے کے عقب سے اچانک نکل کر دوڑتا ہوا چھورول کے پاس پہنچا اور ہمراہ چلتے چلتے عجیب وغریب حرکتوں سے ستانے لگا۔ قافلے کو قریب پہنچتا دیکھ کر میں نے پیڑ کی آڑ لی۔

چھورول اُس کی بدمزاجی سے بخوبی واقف تھی۔ اس لئے گھبرا کر بولی۔

"دیکھو رگزن۔ آج تک میں نے ابالے سے تیرے کسی بھی اوچھی حرکت کی شکایت نہیں کی ہے۔ لیکن اب مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ اگر اب کی بار تم نے کوئی بے ہودہ حرکت کی تو آج ابالے سے صاف شکایت کر دوں گی۔ پھر نہ کہنا۔"

"کر لینا۔ جی کھول کر کر لینا۔ میں ڈروں گا نہیں۔ تم تو ایسے ڈرا رہی ہو جیسے میں بھگا لے جانے کا پلان کر آیا ہوں۔"

"تیرے ساتھ بھاگے میری جوتی۔ آئینے میں اپنی بھونڈی صورت دیکھی ہے کبھی۔؟ دو کوڑی کے گھٹیا انسان مجھے بھگانے کی بات کرتا ہے............!"

دوسری لڑکیاں ان کی بڑھتی ہوئی تکرار سے پریشان ہو اُٹھیں۔ وہ چاہتی ہوئی بھی بیچ بچاؤ کی جرات نہ کر پائیں۔ اُن کے لئے بے بسی سے نوک جھونک دیکھتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ رگزن طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تو تمہارے لئے راجے مہاراجے آئیں گے کیا۔؟"

"آئیں نہ آئیں تو اپنی خیر منا............"

"کیوں مناؤں تو ہوتی کون ہے...... کیا تم کسی شہر کی سُندر شہزادی ہو۔"

”نہیں تو کیا تیری طرح گنگو تیلی ہوں۔“

”مجھے گنگو تیلی کہتی ہے ٹھہر مزا چکھاتا ہوں۔“

”خبردار رگزن جو کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو۔ دیکھو کہے دیتی ہوں ...... میں ابا لے سے کہہ دوں گی۔“

لیکن وہ اُس کی دھمکیاں ماننے والا کب تھا۔ ایک بار شرارت کرنے کی ٹھان لیتا تو کر کے ہی دم لیتا۔

رگزن نے دھمکیوں کی پرواہ کیئے بغیر اپنی سر کی ٹوپی میں سے سوئی نکال کر گدھے کی پیٹھ میں اس طرح چُبھو دی کہ بے چارہ غریب جانور درد سے تلملا کر بے قابو ہو گیا اور چھلانگیں مارتا ڈھینچوں ڈھینچوں کی درد بھری صدائیں دیتا سارے گدھوں سے آگے ایسا سرپٹ بھاگا کہ چھورول اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ ہر چند کہ گدھے کے ایال پکڑے۔ جُھک جُھک کر کانوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ بچاؤ کے لئے گدھے کی گردن سے لپٹ کر جھول گئی۔ مگر ناکامی نے بے توازن کر کے کسی دوسری کھیت کے کھاد کے ڈھیر پر سر کے بل پٹخ ڈالا۔

رگزن اپنا کارنامہ انجام دے کر رفو چکر ہو گیا۔ ساری سہیلیاں اپنے اپنے گدھوں سے اُتر اُتر کر دوڑتی ہوئی اُس تک جا پہنچیں۔ اُسے سہارا دے کر کھڑا کیا ہی تھا کہ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ چھورول مٹی میں سرتاپا لت پت ہو کر کسی بھوتنی سے کم نہ لگ رہی تھی۔

لڑکیاں ہنستی ہوئی اُس کے کپڑے جھاڑنے لگیں۔ اُس کی بالوں اور منہ کی مٹی صاف کرنے لگیں۔

یہ ساری بچگانہ حرکتیں دیکھنے کے بعد میں ڈیرے میں چلا آیا۔

باب ساتواں

حسبِ معمول ہم نے جانفشانی کے ساتھ اپنے آپ کو بچوں کی درس و تدریس میں مصروف کر دیا...... اپنے کام میں مہارت کے بل پر چند ایک آوارہ بچوں کو چھوڑ کر سارے بچوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

سبھی دل لگا کر پڑھنے لگے۔ ہماری محنت رنگ لاتی گئی...... دن ہفتے اور مہینے گزر گئے۔ یہاں تک کہ ماضی کے مقابلے میں اسکول کا نتیجہ بہتر نکلا...... گاؤں والوں میں ہماری عزت اور مقبولیت بڑھ گئی...... ہر کوئی ہم پر جان چھڑکنے لگا۔ کڑی محنت اور جانفشانی کی سراہنا ہیڈ ماسٹر صاحب اور مقامی اساتذہ نے بھی کی۔

واقعی ہائی کلاس کا ریاضی اور سائنس پڑھانا آسان کام نہ تھا۔

اتنا ہی نہیں...... لڑکیوں کے لئے کھو کھو کے علاوہ نت نئے کھیلوں کا آغاز کیا...... تعلیم اور کھیلوں کی سرگرمیوں سے اسکول میں نئی جان آ گئی...... قاعدے قانون دُرست ہوئے...... نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء و طالبات ۲۶ رجنوری اور ۱۵راگست کے جلسوں میں حصّہ لینے لگے۔ کھیلوں اور ڈراموں کے مقابلوں میں انعامات پانے لگے............

اسکول کا نام خوب چمکا......اعلیٰ حکام کارکردگی سے متاثر ہوکر اسٹاف کا وقار بڑھانے کے لئے وقتاً فوقتاً دورے کرنے لگے...... ہیڈ ماسٹر صاحب نے آفیسران کے روبرو اسکول کا نام روشن کرنے کا سہرا کھل کر میرے سر باندھا۔ جس کا اعتراف سارے اسٹاف نے کیا...... حقیقت تو یہ ہے کہ سارا اسٹاف قدم قدم پر میرا ساتھ نہ دیتے تو میں اپنی کوششوں میں سو فیصد کامیاب کبھی نہ ہو پاتا...... پھر بھی فخر سے میرا سینہ پھول چکا تھا۔

اتنا کام ہونے کے باوجود بھی چند سر پھرے، شرارت پسند اور منہ زور بچے میرے لئے چلینج بنے ہوئے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ نمایاں بے ہودہ حرکتیں رگزن کی تھیں۔ جو تازہ تازہ بانکا جوان بن چکا تھا۔ اور اسکول، گھر یا باہر کہیں بھی رذالت سے باز نہ آیا تھا۔

میں جانتا تھا ایسے عنفوان شباب یعنی تیرہ سے اُنیس سال تک کی لڑکے لڑکیوں کے چند سال ہی بگڑنے یا سُدھرنے کے لئے فیصلہ کُن ہوتے ہیں ......اس زمانے میں وہ من مانی شرارتیں بغاوت، نفس کشی، عبادت، ریاضت کچھ بھی کرنے کے مجاز ہوتے ہیں...... کسی کا ٹوکنا، روکنا یا ڈانٹنا ان کے ضمیر کو جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ انہیں صحیح راستے پر ڈالنے کے لئے ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ، پیار محبت اور نفسیات کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہی سب جانتے ہوئے شروع شروع میں رگزن کی شرارتیں چھڑانے، اُسے تعلیم کی طرف راغب کرنے اور ایک سُلجھا ہوا طالب علم بنانے کے لئے میں نے پیار و محبت اور نفسیات کا بے حساب زور آزمایا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُس کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آیا...... اُسے ترقیاتی منازل کے سپنے دکھائے......لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُلٹا اُس کی شرارتیں دو چند بڑھ گئیں ......بچوں کو ستانا ......لڑکیوں سے گھناؤنا مذاق کرنا......اساتذہ سے طوفانِ بدتمیزی سے پیش آنا اُس کا معمول بن گیا.......... یہ بُری عادات اسکول اور قوم کے لئے، اُس کے والدین کے لئے بلکہ خود اُس کے اپنے لئے بھی خوش آئند بات نہ تھی۔

مجبور ہوکرایک دن میں نے رگزن کے والد وانگیل کو اسکول میں طلب کرلیا۔

''جولے سر جی.........آپ کو مجھے بُلایا ہے جی...............''

رگزن کا باپ لال رنگ کے میلے کمر بند سے بندھا ایک لمبا کالا چوغہ زیب تن کیئے، اونچے قسم کی لداخی ٹوپی جس کے دونو کیلیئے سرے ماتھے کے دائیں بائیں دوطرف کو اُٹھے تھے سر پہ ترچھے انداز میں جمائے کلاس کے دروازے پرنمودار ہوا۔

''ہاں ہاں آیئے آیئے.....اندر آیئے.....آپ وانگیل ہیں..........؟''

''کاسہ کاسہ (جی جی) جناب..........ہم وانگیل ہوں۔''

ادب سے جواب دیتے وقت دونوکوں والی اُس کی چنگیزی موچھیں اور ٹھڈی کی مہین نوکیلی تُنگن داڑھی خوب پھڑ پھڑائی.....رگزن باپ کو دیکھ کر ڈر کے مارے بغلیں جھانکنے لگا۔

''آیئے آیئے.....اندر آیئے۔''

''جی میربانی میربانی..........'' کہہ کر وانگیل اندر چلا آیا۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''رگزن آپ کا بچہ ہے..........؟''

''کاسہ کاسہ (جی جی) جناب میرا بڑا بچہ ہے۔''

''بہت شرارتی ہے..........چھوٹے بڑے ہر کسی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتا ہے...... پڑھائی میں بھی دھیان نہیں دیتا.....بہت سمجھایا.....سُدھرتا نہیں ہے.....یہی حال رہا تو نویں جماعت کے امتحان میں رہ جائے گا۔ میری بات سمجھتے ہیں نا۔ پورا ایک سال ضائع ہوگا۔''

''کاسہ کاسہ (جی جی) جناب..........آپ ٹھیک کہتا ہوں..........''

اُس نے اپنے بیٹے رگزن کی طرف گھور کر دیکھنے کے بعد تسلسل کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

''کمینہ کو اپنا اماں لے (ماں جی) کا لارڈ پیار سے خاراب (خراب) کیا ہوں جناب...... ہم بھی اس کا واجہ (وجہ) سے بہت پریشان ہوں..........ہم نے اس کتا کو گار (گھر) میں بہت سزا دے کر تھک گیا ہوں.....کیا کروں گا جناب.....ہم گار (گھر) میں سزا دیتا ہوں......

اسکول میں ماسٹر صاحب لوگ بار بار ڈھیل دیتا ہوں ......ہم بہت ناکام ہوگیا ہوں ......
بچہ (خاراب) خراب ہوگیا کیا کرے گا...... سچ میں ہم باپ ہوں مگر ایک ہمارا قصور نہیں ہوں
جناب ......اسکول کا بھی قصور ہوتا ہے نا جناب ...... سب ماسٹر صاحب لوگ بھی اس کا
(خاراب) خراب ہونا کا ذمہ دار ہوں نا جناب......ہم چھوٹا منہ بڑا بات والا ہوگیا......مگر ہم سچ
بولتا ہوں سب ماسٹر صاحب لوگ کا کمزوری بھی ہوتا ہے معاف کرنا جناب۔ ایسا کتا کو خوب
خوب پٹائی ہوگیا تو دوسرا جانور لوگ بھی ٹھیک ہوتا ہے......مگر ہائے......کیا کرے گا......ان
پڑھ آدمی......اُردو بات ٹوٹا پھوٹا ہے......کم کم آتا ہے۔ معاف کرنا......ہم بک بک کیا......ہم
تھوڑا اَن پڑھ ہوں بے وقوف ہوں......ہم کو معاف کرنا جی............"

"اچھا تم جا سکتے ہو............"

"جو لے جی............میرا بچہ آپ کا ہاتھ میں جناب۔ آپ ہمارے لئے بھگوان کا اوتار
جیسا......ہاں جی......جو لے جو لے"

وہ اپنی چٹیا سہلاتا چلا گیا ......اُس کی ساری ٹوٹی پھوٹی باتیں میری سمجھ میں آ گئی
تھیں۔ کٹے پھٹے جملوں میں رگزن کے بگڑنے کا سارا قصور ہمارے سر تھوپ گیا تھا۔

اُس کے چند جملے دل ودماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑے۔

رگزن کے بگڑنے میں ہماری عدم توجہی، لاپرواہی، غیر ذمہ داری کی شکایت
صاف عیاں تھی۔

میں جھنجھلا کر رہ گیا۔ شاید اُس کی نظر میں ہم نالائق اور نکمے تھے......میرے روم روم نے
ذلت آمیز الزام کے سبب میرے ضمیر کی ملامت کردی۔ رگزن اور دوسرے چڑچڑے بچوں کو
سُدھارنا واقعی ایک بڑا چلینج بن چکا تھا۔ جسے میں نے قبول کرنا مناسب سمجھا۔

بس پھر کیا تھا وقت کے ساتھ ساتھ بچوں کے تئیں میرے رویے میں ایسی سختی پیدا ہوگئی
کہ ہوم ورک کی چیکنگ کے بہانے ہر کلاس کو جان بوجھ کر تختۂ مشق بنانے لگا۔ قابل و نا قابل

طلباء معمولی غلطیوں پر پٹنے لگے۔ کسی نے احتجاج کیا تو اُس پر سزا کی ڈگری بڑھا دی...... بچے حیران تھے کہ یکا یک اس خوش مزاج اُستاد میں یہ نا قابل یقین تبدیلی کیونکر آ گئی۔

تعلیمی جاگرتی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کئی شرارت پسند بچے قابو میں آتے گئے۔ لیکن رگزن اور اُس کے چند ساتھیوں پر لگام چڑھانا اب بھی دشوار ہو رہا تھا اساتذہ کرام بھی زور آزمائی میں خِفّت اُٹھا چکے تھے۔

محکمہ تعلیم کی جانب سے مار کٹائی کے بدلے پریم اور شفقت سے تعلیم دینے کا قانون پاس ہے۔ لیکن یہ قانون اس پچھڑی ہوئی ریاست میں کسی طرح کارگر ثابت نہ ہو رہا تھا۔ بچے روز بہ روز ہر گاؤں ہر شہر میں بدمزاج اور سر پھرے ہوئے جا رہے تھے۔

یہ قانون تو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جہاں ہر گھر کے افراد تعلیم یافتہ اور سُلجھے ہوتے ہیں۔ اور کئی اچھے اخلاق تو بچے گھر سے ہی سیکھ کر آتے ہیں۔

جبکہ ہمارے ملک کے ہر شہر ہر گاؤں میں ان پڑھ خاندانوں کی اب بھی بھرمار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بچے اتنے سُلجھے ہوئے نہیں ہوتے۔ تبھی تو نئی جوانی میں قدم رکھتے ہی بے باک اور سر پھرے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان پر مغربی طرز حکمت عملی اختیار کرنے کے بجائے دیسی طریقہ کار ہی اکثر موثر ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ طریقہ کار عقل نما یعنی بید کی پتلی سی چھڑی ہے۔ جو اچھے اچھے سر پھروں کے عقل ٹھکانے لگا دیتی ہے۔

پس رگزن اور اُس کے ساتھیوں کے لئے میں نے دیسی طریقہ کار ہی اپنانے کا ارادہ کر لیا۔

ایک دن میں وقفہ لنچ کے دوران دفتر میں بیٹھا ہیڈ ماسٹر صاحب سے کسی مسئلے پر محو گفتگو تھا کہ ایک لڑکا دوڑا دوڑا آیا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کرتے ہوئے بولا۔

”سر جی سر جی رگزن نے صنم کے آنکھوں میں چاک کا سفوف پھونک دیا ہے۔ اور صنم درد کے مارے چلا رہا ہے۔“

ہم دونوں دوڑے دوڑے اُس جگہ گئے جہاں صنم واقعی درد کے مارے اُٹھک بیٹھک

کررہا تھا۔

ہیڈ ماسٹر بے بسی کے عالم میں چیخ سے پڑے۔

"وسیم صاحب کچھ کیجئے۔ ورنہ اِس کی آنکھیں جل جائیں گی۔ یہ اندھا ہوجائے گا۔"

میں نے جلدی سے چپراسی کو آواز دی۔

"اے فونچک جلدی سے پانی کا جگ لے آنا۔"

چپراسی دوڑا دوڑا پانی کا جگ لے آیا۔ اور میری ہدایت پر صنم کی پھڑ پھڑاتی آنکھوں میں پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔ میں نے اُسے ہدایت دی کہ وہ چھپاکے مارنے کا عمل مسلسل جاری رکھے۔ وہ ایسا ہی کرتا گیا۔

میں نے دوڑ کر لیبارٹری میں سے سرینج نکالی اور صنم کے پاس جا کر پہلے تو اُسے کمر کے بل لٹا دیا۔ پھر سرینج میں پانی بھر بھر کر دونوں آنکھوں میں باری باری پچکاری جاری کردی۔ لگ بھگ آدھ گھنٹہ ایسا کرتے رہنے کے بعد اُس کی آنکھوں کی جلن کم ہوئی۔ لیکن ان میں ہلکی ہلکی سُرخی اب بھی موجود تھی...... وقتی طور ہم نے علاج کردیا تھا۔ صنم آنکھیں بند کئے ایک جانب کو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اس لڑکے نے بڑا پریشان کردیا ہے۔" ہیڈ ماسٹر سٹپٹا کر غصے میں بڑبڑایا۔ "جتنا سُدھارو سدھرتا ہی نہیں...... جتنا سمجھاؤ۔ سمجھتا ہی نہیں۔ جانے کس مٹّی کا بنا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے دفتر میں چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ رگزن کے خلاف کوئی ایکشن ضرور ہوگی لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور معاملہ ایسے دب گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس دن میں نے بڑی بے چینی محسوس کی۔

پھر کئی دنوں بعد ایسا ہوا کہ پیرڈ بدلنے کی گھنٹی بجی...... ہر کلاس سے اُستاد نکل نکل کر دوسرے کلاسوں کو چلے گئے۔ اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق ایک اُستاد نویں جماعت میں داخل ہوا تو سارے طلباء وطالبات تعظیم میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جب بیٹھے تو دھڑام کی آواز کے

ساتھ ایک لڑکا خون میں لت پت ہوگیا...... معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ بیٹھتے وقت شرارتی رگزن نے اُس لڑکے کی اسٹول پاؤں سے کھسکادی تھی جس کی وجہ سے بیٹھتے وقت توازن قائم نہ رکھ سکااور گرتے گرتے سر کا پچھلا حصہ ڈیسک سے ٹکرا کر پھٹ گیا۔

کلاس کے اندر باہر فرسٹ ایڈ بکس کے لئے بھاگم بھاگ ہوئی۔

ہیڈ ماسٹر نور بو صاحب نے سُنا تو وہ بھی کلاس کی جانب دوڑ پڑے۔زخمی لڑکے کی فوری مرہم پٹی کی گئی۔رگزن کو کان سے پکڑ کر دفتر میں لایا گیا...... ہیڈ ماسٹر صاحب نے کئی صلواتیں سُنائیں......لیکن اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ وہ سر پھروں کی طرح زیر لب مسکراتا رہا۔نور بو صاحب خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔

''ہم تو سوچ رہے تھے اب کی بار اُسے کڑی سزا دی جائے گی۔''

لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب چلّا کر دھتکارتے ہوئے خفگی سے صرف اتنا ہی بولے۔

''ابے پاگل رگزن کے بچّے تم کبھی نہیں سُدھرو گے......دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے......بد دماغ......بد بخت کہیں کے دفع ہو جا۔میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا......کسی دن تُو کسی کی جان لے کر پھانسی پر چڑھ جائے گا۔''

یوں تو میں نویں جماعت کے بغل والے کلاس میں بیٹھا تھا لیکن میری ساری توجہ رگزن پر مرکوز تھی......نور بو صاحب کی کرخت آواز میرے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔

جونہی رگزن دفتر سے نکلا تو میری کھڑکی کے قریب سے گزرتے وقت دالان میں کھڑے چپراسی کو اُس پر طنز کرتے سُنا۔

''کیوں رگزن..........مار پڑی کیا۔؟''

''ابے جا بے بھونچو''

اُس نے بے شرموں کی طرح جواب دیا۔''میں کسی سے ڈرتا ہوں کیا۔؟''

فونچک چپراسی تو سہم کر خاموش ہوگیا لیکن رگزن کی بے باکی اور بے حیائی پر میرا

ضمیر تڑپ اُٹھا۔

وہ مغرورانداز میں چلتا ہوااپنے کلاس میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اگلے پیرڈ کی گھنٹی بجی۔اب کی بار مجھے نویں جماعت میں ریاضی پڑھانے جانا تھااور دوسری کلاسوں کی طرح نویں جماعت کے بچے بھی مجھ سے بے حد مرعوب تھے۔ میرے آتے ہی اُنہیں سانپ سونگھ جاتا تھا۔

نویں جماعت میں داخل ہوتے ہی سارے بچے تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔اور جب بیٹھے تو میں نے رگزن کو کھڑے رہنے کا اشارہ کیا۔وہ کھڑا رہا۔

میں نے مسکرا کر اُس سے زخمی لڑکے کے چوٹ کی وجہ پوچھی۔

رگزن نے میرے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔پھر مطمئن ہوکر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے دیدیں نچا کر بولا۔

"سر اِسے اپنا ہوش ہی نہیں رہتا۔جانے کن خیالوں میں کھویا رہتا ہے۔بیٹھنا کہیں تھااور بیٹھا کہیں اور............"

ظاہر ہے اس کا بے تکا سا جواب میرے ضمیر کے لئے تکلیف دہ تھا۔میں نے غصے میں تلملا کر پوچھا۔

"یہ بتاؤ اسٹول کس نے کھسکایا تھا............"

رگزن میرے سوال پر ذرا سا گھبرایا۔لیکن پھر بے باکی سے جواب دیا۔

"سر میں نے تو یونہی مذاق کیا تھا۔"

"اچھا............تو تم اسکول پڑھنے نہیں مذاق کرنے آیا کرتے ہو۔!"

"نہیں سر............میں پڑھتا بھی ہوں۔"

ٹھیک ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ ہم نے کل پڑھا تھا آج وہ تمہیں پوری طرح یاد ہے....."

"ہاں سر ہے نا۔"

''تو ذرا سناؤ...........کل ہم نے چھٹا فارمولہ جو پڑھا تھا۔ وہ کیا تھا۔؟

''سر وہ......سر کل ہم نے......سر کل میں......سر میں بھول گیا۔''

رگزن کی ہڑ بڑاہٹ سے مجھے کافی تسلی ملی اس کی کمزور رگ پکڑ میں آچکی تھی۔ میں نے اس کے دوسرے شرارت پسند ساتھی کی طرف جو منہ دبائے رگزن کی حرکتوں پر ہنس رہا تھا اشارہ کر دیا۔

''اچھا چلو تم ہی سُناؤ...........''

دوسرا ساتھی بغلیں جھانکتے ہوئے کھڑا تو ہو گیا......لیکن کوئی جواب نہ دے پایا۔

مجھے انہیں پیٹنے کا بہانہ مل گیا اور پتلی سی چھڑی جو اکثر میرے ہاتھ میں رہتی تھی سے دونوں بدمعاشوں کی ہلکی سی دُھلائی کر دی......اور جب وہ ہتھیلیاں سہلانے لگے تو انہیں بٹھا دیا۔

سارے بچے سہم چکے تھے...........میرا مقصد صرف ان پر رعب جما کر انہیں شرارتوں اور آوارہ گردی سے باز رکھنے کا تھا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے لیکن مجھے لگا رگزن مجھے غصے میں گھور رہا ہے۔

باب آٹھواں

بہار کا ایک خوشگوار دن تھا۔

ہر طرف ہریالی بکھری پڑی تھی۔ کھیتوں میں جو کی فصل جواں ہو کر مستی لٹا رہی تھی۔ گاؤں کے اندر باہر جہاں کہیں بھی پیڑ تھے سرسبز ہو کر گویا مست حسیناؤں کی طرح اپنی زُلفیں بکھرائے کھڑے کھُلی دھوپ کا مزہ لے رہے تھے۔

ہر منظر سہانے موسم کی گواہی دے رہا تھا۔ کبھی کبھار گرم ہواؤں کا کوئی جھونکا آنے والی گرمی کی تپش کا احساس بھی دلا جاتا۔

آج پہلی بار ہمارے اسٹاف کے چند مقامی دوست ہمارے لئے پکنک کا پروگرام بنانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس سے پہلے پکنک کے لئے جتنے بھی اتوار منتخب ہوتے رہے۔ موسم کی نامہربانی ازلی دشمنوں کی طرح آڑے آ کر سارے اتواروں کا پروگرام چوپٹ کرتی رہی۔

آج کے اتوار کو چمکتی آفتاب نے مہربان ہو کر ایسا پُر فضا بنا دیا تھا کہ روپہلی دھوپ میں گہرے نیلے شفاف آسمان پر برف جیسے سفید چھوٹے بڑے روئی نما تیرتے گالے بے جان ہو کر جنوب کی طرف بھاگتے چلے گئے۔

گاؤں کی بستی سے ہٹ کر ایک اونچی جگہ پر سرسبز پیڑوں کے درمیان کھُلی سی جگہ کا انتخاب کیا جا چکا تھا............ جگہ اچھی تھی۔ سامنے ہی ایک جھرنا بھی گنگناتا بہہ رہا تھا۔

غلام قادر، چپراسی اور میرے سوا باقی سبھی یعنی لاما جی، دورجے اور اکرم، بچھی ہوئی دری پر

پاؤں پسارے بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ڈوب گئے۔ نشیب و فراز کی بکھری ہوئی بستی اور لہلہاتے کھیتوں کا روح پرور منظر دل و دماغ کو خوب لُبھانے لگا......

غلام قادر خانسامانی کے فرائض انجام دینے میں جُٹ گیا۔ فونچک چپراسی چھوٹے موٹے کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اکرم اور میری عمر میں لگ بھگ آٹھ دس سال کا فرق رہا ہوگا۔ لہٰذا عمر میں چھوٹا ہونے کے ناطے پیاز چھیلنے اور کترنے کا کام مجھے سونپا گیا۔ میں نے خوشی سے اپنا کام شروع کیا ہی تھا کہ پیاز سے نکلنے والی تیزابی فواؤ سے میری آنکھیں بھر بھر آئیں۔ نتھنے پھڑ پھڑا اُٹھے۔

اکرم بڑی عمر کے باوجود میری حالتِ بد پر بے قاعدگی سے قہقہہ مار کر ہنستا ہوا مذاق پر اُتر آیا۔ ''میں واری جاواں ...... کیوں روتے ہو بچّو؟ ......ابھی دو سال پورے کہاں ہوئے۔ کھلی فضا میں اتنا روتا ہے تو رات کو بستر میں منہ چھُپا کر کتنا روتا ہوگا۔!''

اکرم کے مزاحیہ انداز پر نہ صرف ہم سبھوں کی ہنسی چھوٹی بلکہ خود اکرم کی ہنسی کا ریج بھی بڑھتا ہی چلا گیا۔ کچھ ہی دوری پر غلام قادر اسٹوو پر چائے چڑھائے بیٹھا تھا۔ اسٹوو کے شور میں چپراسی اور اُس نے اکرم کی چٹپٹی باتیں بھلے ہی نہ سُنی ہوں مگر دونوں کے مُسکراتے چہرے ہر بات کو سمجھنے کی گواہی دے رہے تھے۔ یا پھر ہماری مُسکراہٹ دیکھ کر مصنوعی انداز بنائے ہوں۔

''چوہے کا دل لے کر سرکاری نوکری کرنے کو کس نے کہا تھا بے۔۔ پہلے سوچ لیا ہوتا بچّو۔۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔۔ اب بھگتو۔ اور سڑتے رہو۔ اس قید سے دو سال تک کوئی آزاد نہیں کر سکتا۔۔ دورجے صاحب سمجھائیے نا۔''

دورجے اور لاما جی کو ہنستے دیکھ کر اکرم لاما جی سے بولے۔

''لاما جی آپ ہی سمجھائیے نا۔ شاید آپ کی سمجھ لے............''

لاما جی کھی کھی کرتے ہنستے رہے۔ پھر بولے۔

''آپ کی بات وہ خوب سمجھتے ہیں............''

"کہاں سمجھتے ہیں لاما جی۔ پچھلے ایک گھنٹے سے روئے جا رہا ہے۔اور اتنا رویا ہے کہ جھرنے میں سیلاب لے آیا ہے۔ یہی حال رہا تو اس کا تو کچھ نہیں ہوگا۔ہم سب تنکے کی طرح بہہ جائیں گے.......... بچو۔ بہت رولیا۔ بس بس۔ بہت رولیا۔"

پھر جیسے یک لخت چیخ کر ڈانٹ پلا دی۔

"ابے بس کر.......... خبردار جو ایک آنسو بھی بہایا تو۔اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں بہا لے جائے گا کیا..........؟"

اکرم نے اچانک ایسی مزاحیہ اداکاری سے ڈانٹ دیا کہ ایک لمحے کے لئے سب کی چُپی لگ گئی۔ پھر جو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تو فضا میں قہقہے بلند ہوئے۔غلام قادر اور چپراسی کی بتیسیاں بھی چمکنے لگیں۔

پیاز کترے جا چکے۔ چائے بھی بن کر سامنے آ گئی۔

چائے کی چسکیوں کے دوران مکمل سکوت چھایا رہا۔شاید کسی کو بھی گفتگو کا موضوع نہیں مل رہا تھا۔ایسے پُر فضا ماحول میں خاموشی مزہ کرِ کرہ کئے دے رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے چائے پیتے پیتے ٹیکری پر بنے بدھ وہار کی جانب دیکھتے ہوئے گفتگو کا ماحول بنانے کی کوشش کی اور لامہ جی سے مخاطب ہوا۔

"یہ بدھ وہار کتنا شانت اور پُر وقار منظر پیش کر رہا ہے۔"

میرے ایسا کہتے ہی سبھوں کی نگاہیں ٹیکری کی طرف اُٹھیں۔گاؤں سے ہٹ کر ٹیلے پر بنے اس گونپے کی بناوٹ ہی کچھ ایسی تھی کہ دور سے دیکھنے والوں کو بودھ بھکشوؤں اور اُن کے دیوی دیوتاؤں کے مسکن ہونے کا صاف گماں ہوتا تھا۔اس کے شانت اور پُر سکون ماحول میں کبھی کبھار اِکے دُکے بودھی پیشوا ہلکے لال رنگ کا مخصوص لباس زیب تن کئے ٹیکری کے رستے اوپر نیچے آتے جاتے دکھائی دے جاتے۔یا کبھی کبوتروں کا جھنڈ بدھ وہار کی چھت سے اُڑان بھر کر گاؤں کے چکر کاٹ لیا کرتا۔

لاما جی بدھ وہار کی جانب عقیدت سے دیکھ کر مُسکرا دیئے۔ بولے۔

"وسیم صاحب۔ لداخ میں ہر جگہ چاہے وہ چھوٹے گمپہ ہوں یا بڑے، سارے گونپے ایسا ہی منظر پیش کرتے ہیں۔"

"سچ ہے لاما جی ...." اکرم نے اپنی جانکاری دینی شروع کردی۔ "آج سے دس بارہ سال قبل جب میرا تبادلہ پہلی بار دو سال کے لئے لداخ ہوا تھا۔ تب اس زمانے میں ایک سرما کی چھٹیوں میں یہیں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اور اُس دوران تفریحی طور لگ بھگ سارے گونپاؤں کے میلے دیکھنے کو ملے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے وہ گمپے اتنے یا اس سے زیادہ اونچائی پر دیکھے تھے۔

"جی ہاں" لاما جی گویا ہوئے۔ سارے گمپاؤں کی اونچائی یکساں صورت میں دیکھنے کو کہیں نہیں ملے گی۔"

لاما جی کی گفتگو ختم ہوتے ہی میں نے پوچھا۔ "اکرم اُن میلوں میں جو آپ نے اُن دنوں دیکھے آپ کو اپنی دانست میں کیا خاص بات نظر آئی۔"

"سب کچھ خاص ہی خاص تھا میرے لئے۔ موسم سرما میں جب عبور و مرور کے سارے درّے برف باری سے بند ہو جاتے ہیں۔ تب یہی میلے پردیسیوں کی تفریح کا سامان بنتے ہیں۔ یہاں کی تہذیب و تمدن، طرز معاشرت، بھائی چارہ اور رہن سہن کو سمجھنے اور جاننے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ گمپاؤں کے اکثر میلے جاڑے میں ہی ہوا کرتے ہیں لیکن ایک بات جو میرے پلے کبھی نہیں پڑی کہ گاؤں سے اتنے الگ تھلگ، کسی اونچی ٹیکری پر گونپاؤں کی تعمیر کس مصلحت کے تحت ہوئی ہوگی۔"

لاما جی اکرم کا سوال سُن کر مُسکرا دیئے پھر اطمینان سے سمجھانے لگے۔

بھکشوؤں یعنی تارک الدنیا کا ٹھکانہ عیش و آرام کے بیچ ہو تو بھکشو ہونے کا کیا مطلب۔ گیان دھیان کا وردھان ان سب سے دور رہ کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

''جی ہاں۔سوتو ہے......'' اکرم اقرار میں سر ہلا کر خاموش ہوا ہی تھا کہ میں نے لاما جی سے پوچھ لیا۔

''لاما جی۔ بدھ وہار کی اونچائی کے اعتبار سے اوپر نیچے آنے جانے میں کافی پریشانی ہوتی ہوگی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔بچپن سے عادی ہوں۔کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ویسے بھی کشٹ اُٹھانے سے پاپ دُھل جاتے ہیں۔ایسا ہمارا ماننا ہے۔''

''اچھا تو یہ بتائیے۔آپ کے بیوی بچے ہیں۔؟''

اب کی بار میرے سوال کا جواب دورجے دینے لگا۔

''وسیم صاحب۔لداخ میں بودھ بھکشوؤں کے دو فرقے ہیں۔ایک دنیا داری کے اصولوں کو نہیں مانتی۔اور دوسرا اس بندش سے آزاد ہے............ہمارے لاما جی دوسرے فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ چاہیں تو کبھی بھی شادی کے پوتر بندھن میں بندکر ازدواجی زندگی کا روپ دھارن کر سکتے ہیں۔''

''جی جی۔میں سمجھا۔'' میں نے سر کو جنبش دی۔میرے چُپ ہونے پر اکرم نے پوچھا۔

''لاما جی۔بُرا نہ مانیں۔کیا آج کل آپ کی شادی کی آرزو ہوتی ہے۔؟''

''ابھی اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں۔کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔'' کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد آسمانوں کی طرف دیکھتے ہوئے لاما جی پُرسکون انداز میں بولے۔''پُن کمانے کے لئے بہت کچھ تیاگ دینا پڑتا ہے۔''

''بالکل صحیح فرمایا۔'' میں نے متاثر ہو کر جواب دیا۔لاما جی کی روح پرور باتیں سُن کر دورجے نے اُس پر عقیدت بھری نظر ڈالی۔پھر میری طرف گھوم کر بولا۔

''یہی فرق ہمارے لاماؤں کو ہم انسانوں میں معتبر اور پوتّر بنائے رکھتا ہے۔ہم اپنے بودھ بھکشوؤں کی بہت عزت کرتے ہیں۔''

''جی جی۔کرنا بھی چاہیئے۔''

ہماری باتیں ہوتی رہی۔ پریشر کوکر کی سیٹی بجتی رہی۔ غلام قادر خانسامانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے دوپہر کا لذیذ کھانا تیار کر گئے۔ پریشر کوکر کا ڈھکن کُھلا ہی تھا کہ مصالحے دار پکوان کی خوشبوؤں نے نتھنوں کو بے قرار کر دیا۔

کھانا پروسنے کی دیر تھی کہ قریب کے پیڑوں پر چونکا نامی لمبے دُم والے پرندے منڈلانے لگے...... ہر پرندہ سیاہ و سفید دُور نگا اور خوشنما تھا۔ مُدھر بولیوں کے ساتھ چہچہاتے تو لگتا کہ وہ بھی ہماری خوشی میں شامل ہو کر پکوان میں سے حصہ چاہتے ہیں۔ کھانا پروسا گیا۔

میں نے اپنے حصے میں سے کچھ کھانا سبزہ زار پر اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ کئی پرندے پیڑوں سے اُتر کر ان کو چُگنے میں مصروف ہو گئے کئی پیڑوں پر ہی شرماتے اور تکلف کرتے رہ گئے۔

ابھی ہم کھا ہی رہے تھے۔ کہ ذرا نیچے کھڑی فصلوں کے درمیان ہونے والی ہلچل اور سرسراہٹ سے ہماری چھٹی حس بیدار ہو گئی...... اگلے ہی پل دو جانی پہچانی دوشیزائیں کھیتوں کی پگڈنڈی پر کھڑی فصلوں سے ٹکراتی کسی جانور کا تعاقب کرتی نظر آئیں۔

شاید کوئی خرگوش ہوگا۔

دونوں بے تحاشہ اِدھر اُدھر دوڑتی ہوئی جُھک جُھک کر بھاگنے والی جانور پر جھپٹنے کی کوشش کرتی چلی آ رہی تھیں۔

ہم سبھی پیڑوں کی آڑ میں ایسے بیٹھے تھے کہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہ پائے۔ اور اُس جانور کی طرح خود بھی چوکڑیاں بھرتی ہمارے کافی قریب پہنچ گئیں۔

ننھا سا جانور کھیتوں سے باہر آتے ہی صاف دکھائی دیا۔

وہ کوئی خرگوش نہ تھا۔

بکری کا ننھا منھا سا چنچل بچّہ تھا۔

پیارا اور معصوم سا میمنا۔

ہم سبھی کھانا کھاتے ہوئے اِس بھاگم بھاگ کو فٹ بال میچ کی طرح بے چینی سے دیکھتے

ہوئے آنند لے رہے تھے۔۔ میمنا رُکتا بھاگتا مختلف سمتوں میں اس طرح چوکڑیاں بھرتا جاتا کہ دوشیزائیں جھپٹتے وقت بار بار دھوکہ کھاجاتیں اور چاروں شانے چت فرش خاکی پر آجاتیں۔ لیکن گرنے کے باوجود میمنے کو پکڑنے کے مصمم ارادے سے ہر بار اُٹھ اُٹھ کر دوڑ پڑتیں۔

ایک بار تو میمنے پر جھپٹتے وقت میانے قد والی دوشیزہ جھرنے میں اس طرح جاگری کہ چھپاکے کی آواز کے ساتھ ہی دوسری دوشیزہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی۔

شہروں کے شور شرابے کی نسبت دیہاتوں، گاؤں میں عموماً سکوت کا سا عالم چھایا رہتا ہے۔ اس سکوت کو کبھی تو گاؤں کے بیرونی رابطہ سڑک سے گذرنے والی بس، موٹر یا لاری کی آواز توڑتی ہے یا کبھی کسی پیڑ سے پرندے کے چہچہانے کا اِکا دُکا صدا.......... کبھی ڈنگروں کو ہانکنے کی آوازیں یا پھر کھیتوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے دل کو لبھانے والے لوک گیت، ورنہ اکثر سکوت کا وہ عالم چھایا رہتا ہے کہ پتّوں کے سرسرانے کی معمولی آواز بھی صاف سُنائی دے جاتی ہے۔

سارے گاؤں کی طرح ہمارے اس پُر سکون گاؤں کا پکنک کے لئے منتخب یہ پُر فضا مقام بھی اتنا ہی شانت اور خاموش تھا۔ اس خاموشی کو پکنک اوقات میں کبھی تو پریشر کو کر سیٹی بجا کر توڑتی رہی.......... کبھی مست جھرنا مدھر ترنم بکھیر کر کھل بلی مچاتا رہا.......... کبھی پنچھیوں کے چہچہانے سے شور مچا.......... اور کبھی اکرم کے ٹھٹھا مخول سے اُٹھنے والے قہقہوں نے سکوت توڑا۔

لیکن اب کی بار فضا میں گونج دوشیزہ کے کھلکھلا کر ہنسنے سے پیدا ہوئی جو خاموش فضاؤں کی حدوں میں ہلچل مچاتی دور دور تک چلی گئی۔

ہم نے جھرنے میں گرنے والی دوشیزہ کو سنبھالنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ بھیگ کر شرابور ہونے کے باوجود ہمت کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور غصے میں تلملاتی اپنی ہمجولی کے پیچھے بھاگی......

اس بیچ میمنا چوکڑیاں بھرتا بھاگتا ہمارے اتنا قریب پہنچا کہ فونچک چپراسی نے کمال ہوشیاری سے جھپٹ کر پکڑ لیا۔ اور ہمارے کہنے پر پلاسٹک کی چوکور ٹوکری میں چھپالیا۔

دونوں دوشیزائیں بھاگم بھاگ اور ایک دوسرے کی پکڑ دھکڑ کی کوشش کے بعد جب تھک ہار کر دم لینے کے لئے رُکیں تو میمنے کو نہ پاکر سٹپٹا گئیں۔ اور دیوانہ وار ڈھونڈتی پھرتی ہانپتی کانپتی ہمارے اتنی قریب چلی آئیں کہ ہم نے انہیں فٹ سے پہچان لیا۔

ایک نمبردار کی بیٹی چھورول تھی اور دوسری اُس کی سہیلی یانسکِت۔

دونوں بے قراری کے عالم میں میمنے کو دیوانہ وار تلاش کرتی ہوئی قریب آپہنچیں اور اچانک ہمیں دیکھ کر ایسے چونک پڑیں گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔

ہم ان کی حرکتوں پر انجان سے بنے رہے۔ انہیں کچھ بھی محسوس نہ ہونے دیا۔

لاماجی انہیں ٹھٹھکتے دیکھ کر شفقت سے بولے۔

"آؤ گڑیو آؤ............کھانا کھالو............"

دونوں نے شرما کر یکایک فرداً فرداً، سلام بجالایا۔ "جولے۔۔ جولے"۔

ہم بھی سلام بجالائے۔

لاماجی نے دوبارہ انہیں اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے پیار سے کہا۔

"آؤ گڑیو۔ آؤ۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالو۔"

وہ نہ مانیں۔۔ موقع کی نزاکت ہی کچھ ایسی تھی کہ نہ اُن سے رُکتے بنتا تھا نہ لوٹتے۔ رُکتے تو بے شرمی کہلاتی۔ لوٹتے تو میمنے سے ہاتھ دھونا پڑتا۔۔ بڑا سٹپٹا دینے والا مسئلہ تھا۔ کم بخت رگزن نے ستایا نہ ہوتا تو میمنا یانسکِت کی گود سے چھُوٹ کر نہ اُچھل بھاگا ہوتا۔ چھورول کو رہ رہ کر رگزن پر غصہ آنے لگا۔ روز کی طرح آج بھی وہ اپنے ابالے سے رگزن کی شرارت کی شکایت کرنے کا من بنانے لگی۔ یہ اور بات ہے کہ شام ہوتے ہوتے سب کچھ بھول جاتی تھی۔ ورنہ اگر اب تک اُسکی کوئی شکایت کر پائی ہوتی تو رگزن کا حوصلہ اِتنا نہ بڑھا ہوتا۔

"ہاں ہاں۔۔ دیکھو لڑکیو۔" ماسٹر غلام قادر پریشر کوکر کا ڈھکن ہٹا کر دکھاتا ہوا کہنے لگا۔

"دیکھو اس میں کھانا کافی بچا ہوا ہے۔ دونوں بانٹ کر کھالو۔۔ میں پروس دیتا ہوں۔"

''نہیں نہیں ماسٹر جی''۔ چھورول نے فٹ سے جواب دیا۔ ''ہم نہیں کھائیں گے۔''

''اے چھورول۔'' یانسکت بھیگے فومت (چوغہ) سے بے پرواہ ہوکر ٹھوکا دیتی ہوئی لداخی زبان میں بولی۔ ''تم پوچھونا۔''

''ذرا ٹھہرو۔'' چھورول نے بازو دبا کر دھیرے سے کہا۔ ''ابھی پوچھتی ہوں۔'' ہم اُن کی بولی نہ سمجھ پائے اور دور جے کی طرف منہ کھولے مجسمہ حیرت بنے دیکھنے لگے۔ وہ بھی کمال کا مسخرہ تھا۔ یانسکِت کا مطلب سمجھنے کے باوجود مزاحیہ انداز میں پگلوں کی طرح فٹ سے اردو میں بولا۔

''ہاں ہاں۔۔ پوچھو پوچھو۔۔ کیا پوچھنا ہے۔۔ پوچھو پوچھو۔۔ یہی پوچھنا ہے کہ ہم نے پکایا کیا ہے۔۔؟ بھئی جو بھی پکایا ہے۔ تھالی پر دیکھ کر جان جاؤ۔۔ اور کچھ۔؟''

چھورول نے ''نہیں نہیں'' کہہ کر اُس کی بات جھٹک دی۔ اور بے چین ہوکر آس پاس دیکھنے لگی............

دور جے اُس کی پریشانی مزید بڑھانے کی غرض سے خود بھی آس پاس کا مصنوعی جائزہ لینے لگا............ پھر اگلے ہی پل دیدیں نچاتے پلکیں جھپکاتے بولا۔

''کیوں اچھی جگہ ہے نا............ ہمیں تو یہی جگہ پکنک کے لئے موزوں لگی۔ ہم نے یہاں بیٹھ کر ٹھیک کیا نا............؟ تم دونوں بھی بیٹھ کر تھوڑا سا کھالو............ یہاں بیٹھ کر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے............''

یانسکِت اُس کی باتوں سے دھیان ہٹا کر فومیت (چوغہ) کا دامن نچوڑتی ہوئی بڑبڑائی۔ ''اب کیا ہوگا چھورول............؟''

اس بار اُس نے دوبارہ لداخی لب ولہجہ دہرا کر ہمیں اُلجھن میں ڈال دیا۔ حالانکہ وہ اردو بولی سمجھتی تھی۔ البتہ کُھل کر بولنے میں ہچکچاتی تھی۔ کیونکہ جب جب بولتی۔ گاؤں کے دوسرے ناخواندہ افراد کی طرح ٹوٹے پھوٹے الفاظوں سے اردو بولی کی دُھلائی کر ڈالتی۔ اُس کی باتوں کا مفہوم مشکل سے ہی سمجھ میں آجاتا، جبکہ اُس کی نسبت چھورول اُردو بول چال میں اتنی

بہتر تھی کہ اُس کے اندازِ بیان سے پڑھی لکھی ہونے کا گمان ہوتا تھا............شکل وصورت میں دونوں خوب تھیں۔لیکن چھورول قد اور کشش میں یانسکِت کی نسبت زیادہ جاذب نظر تھی۔یہ اور بات ہے کہ بھیگنے سے اس وقت یانسکِت ہی توجہ کا مرکز بنی رہی۔بھیگے لباس کے چپکنے سے اُس کی انگوں کے خدوخال نظر آنے لگے تھے۔جو کسی کو بھی لُبھانے کے لئے کافی تھے۔ہم سبھی کچھ دیر اُن کی پریشانیوں سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔لیکن اب یانسکِت چھورول سے عمر میں بڑی ہونے کے باوجود روہانسی جیسی ہونے لگی تھی۔تبھی چھورول سے فریاد کرنے کے انداز میں بولی۔

"پہاڑ کی طرف بھٹک گئی تو لومڑی اور بھیڑیئے کھا جائیں گے۔"

دورجے کو یانسکِت کا معصوم سا روہانسہ انداز اتنا بھا گیا کہ دل کے تاروں کو چھو کر سوئے ہوئے احساسات بیدار کر گیا۔اُس کے دل میں ہلچل مچ گئی۔لیکن وہ پھر بھی نا سمجھوں کی طرح مزاحیہ انداز میں دیدیں نچا کر کہنے لگا۔

"کیوں کھا جائیں گے۔تم دونوں کو کھانا ہو تو کھالو۔ہم نے اپنا کھانا کسی لومڑی یا بھیڑیئے کے لئے نہیں پکایا ہے۔"

"نہیں ماسٹر دورجے جی۔" چھورول متجسس نگاہوں سے مسلسل دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتی ہوئی بولی۔"آپ سمجھے نہیں......"

"کیوں نہیں سمجھا۔یہ کیا کہتی ہو؟" ماسٹر دورجے نے جھوٹ موٹ برہمی کا اظہار کر دیا۔بولا،"ارے واہ۔کیا میں اتنا نا سمجھ ہوں۔اور ذرا مجھے یہ تو سمجھاؤ......اپنا کھانا لومڑیوں اور بھیڑیوں کو کھلانا سمجھداری ہے کیا۔؟"

دورجے کے بے تکے انداز پر ہم سارے ہنس دیئے۔بلکہ پریشانی کے باوجود دوشیزاؤں کی بھی ہنسی چھوٹی۔

چھورول نے آس پاس کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میمنے کو نہ پایا تو یانسکِت سے بولی۔

''آؤ چلو۔ ذرا آگے جا کر ڈھونڈتے ہیں۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔ یہاں وقت ضائع کر کے کوئی فائدہ نہیں۔''

''نہیں نہیں ......'' یانسکت رونی صورت بنا کر بولی۔ ''پہلے ان سے پوچھ لو۔ انہوں نے دیکھا ہوگا تو بتا دیں گے کہ کس طرف بھاگی ہے۔ ایک بار بھاگنے کی سمت کا پتہ چل جائے تو ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' چھورول رُک گئی۔ بات موزوں تھی۔

وہ ملتجی انداز میں ہم سے بولی۔

''دراصل ...... یانسکت کی چھوٹی سی بکری کھوگئی ہے۔ ہم اُسی کے پیچھے یہاں تک بھاگتے آئے ہیں۔ نہ جانے یہاں کہاں غائب ہوگئی۔ آپ نے دیکھا ہو تو بتا دیجئے کہ کس سمت کو بھاگی ہے۔''

''ہم نے ......؟'' اب کی بار مجھے بھی مذاق سوجھا۔ میں نے بھی دیدیں نچا کر حیرت کا اظہار کیا'' ہائیں۔ کیا کہا............ وہ ہمارے سامنے سے بھاگی ہے۔ کمال ہے ہم ادھر بیٹھے ہیں اور ہمیں ہی خبر نہیں...... اچھا یہ بتاؤ بکری کے گلے میں کوئی پٹہ کوئی رسی وغیرہ تھی۔''؟

''جی نہیں تھی ...... اور وہ بکری نہیں بکری کا مُنّا سا بچہ تھا۔'' چھورول نے سمجھاتے ہوئے کہا............ یانسکت کی گود سے اُچھل بھاگا۔''

''اتنی لاپروائی کیسے ہوئی تم دونوں سے......؟''

''لاپروائی ہم سے نہیں ہوئی ماسٹر جی .... وہ بد بخت رگزن ہے نا ابا وانگیل کا بیٹا۔ اسی نے اچانک آ کر اس کی گود سے بھگا دیا تھا۔''

رگزن کا نام سُنتے ہی دورجے سے نہ رہا گیا۔ منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔

''اسکول تو اسکول۔ باہر بھی شیطانی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ کیا بدمغز اور کھلنڈرا بچہ ہے۔ دن بھر شرارتوں اور مستیوں میں ڈوبا رہتا ہے............ اُس کو سدھارنے کے لئے کچھ کرنا ہی

چاہیئے۔ورنہ ناسور کی طرح بڑھ کر اسکول کے دوسرے بچوں کو بھی بگاڑ ڈالے گا۔''

دورجے رگزن کی طرف سے کچھ پریشان ہوا۔لیکن میں آج کی پکنک کے موقع پر رگزن کے بارے میں پریشان ہوکر کوئی دردِ سر مول لینا نہیں چاہتا تھا۔کیونکہ آج مدتوں بعد کھلی فضا میں سبزے پر بیٹھ کر سہانے موسم سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔میں نے اپنا موڑ برقرار رکھتے ہوئے دوبارہ مزاحیہ انداز میں کہا۔

''تمہاری بکری۔ہمیں پتہ وغیرہ بتا کر جاتی تو ہم ضرور بتا دیتے۔''

''آؤ نا یانسکت۔''چھورول تلملا کر یانسکِت کا ہاتھ تھامنے لگی۔''یہ تو مخول کرنے پر تُلے ہوئے ہیں......آؤ نا۔ہم خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔''

وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھنے ہی لگی تھیں کہ دورجے اُن کی مایوسی اور بے دلی سے ٹوٹ کر ہمدردی پر اُتر آیا اور اُنہیں روکتا ہوا نرم لہجے میں بولا۔

''کھانا کھا کے چلے جانا......یہیں کہیں ہوگی۔مل جائے گی۔پریشان نہ ہوں......اب میں مذاق کے مُوڑ میں بالکل نہیں ہوں۔آؤ بیٹھو۔''

''نہیں جی......یانسکت پریشان ہے۔یہاں رُکے تو میمنا دور نکل جائے گا۔پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا......ہمیں ابھی ڈھونڈنا ہوگا۔آؤ یانسکِت چلیں......''وہ چلنے لگیں تو ان کی بے تابی کم کرنے کی غرض سے لاما جی کے ہونٹ ہلے۔

''اے گڑیو......آرام سے بیٹھ کر تھوڑا کھالوگی تو تمہاری ننھی بکری خود بخود چلی آئے گی......ورنہ مشکل ہے۔''

اتنا سُن کر دونوں پریشان ہوگئیں۔دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا......لاما جی کو وہ بہت مانتی تھیں۔بھگوان بُدھ اور سارے اوتاروں کی طرح اُن پر بھی دونوں کا بھرپور عقیدہ تھا۔لاما جی تو اوروں کی طرح کوئی بات یونہی کہتے بھی نہ تھے۔کافی سنجیدہ قسم کے انسان تھے......یہ سوچ کر کہ ہوسکتا ہے اُن کی بولی ہوئی بات پیشن گوئی ثابت ہو۔

چارو ناچار جہاں تھیں وہیں مبہوت سی بنی بیٹھ گئیں۔ آپس میں کچھ بھی نہ بول پائیں۔

غلام قادر نے دیکھتے ہی دیکھتے کھانا پروس کر سامنے رکھ دیا...... ہمارے دستر خوان پر اب دوشیزائیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔

کھانا کھانے کے دوران ایک بار میمنا ٹوکرے سے ممیایا۔ تو دونوں سہیلیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی چیز متحرک ہوتی تو ہی نظر آتی...... ٹوکرا تو پیڑ کی اوٹ میں نظروں سے بالکل اوجھل تھا...... دونوں نے کوئی متحرک چیز نہ دیکھی تو اُمید بھری نظروں سے لاما جی کی طرف دیکھا۔

لامہ جی دلاسہ دیتے ہوئے مُسکرا کر بولے۔

''کھاتی جاؤ...... کھاتی جاؤ گڑیو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کاسہ اجنگ لے (جی ماما جی)......'' کہہ کر دونوں اُنکی ہدایت کے مطابق سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گئیں۔

اُدھر بھیگی ہوئی یانسکِت دورجے کو ایسی بھا گئی کہ وہ بار بار سب کی نظریں بچا کر کنکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ یانسکِت اُس کے ارادوں سے بے خبر اپنی پریشانیوں کی دُنیا میں اُلجھی رہی۔

کھانا کھا چکے............

برتن ورتن سمیٹے گئے تو چپراسی فونچک نے ٹوکرا لاکر لاما جی کے سامنے رکھ دیا۔

لاما جی بولے۔

''لو گڑیو...... سنبھالو اپنے بکری کے بچے کو......''

''جی......!''

دونوں لڑکیاں پہلے تو ٹوکرے کی طرف دیکھکر حیرت زدہ رہ گئیں...... پھر بے تحاشہ خوشی سے اُچھل کر بہ یک وقت بولیں۔

''او۔ تو اس میں ہے ہماری بکری کی بچّی......''

فونچک چپراسی نے مُسکرا کر جواب دیا۔
"میں نے پکڑ کر سنبھال رکھی تھی۔"
فونچک تم کتنے اچھے ہو میرے بھائی......تم کتنے اچھے ہو شکریہ شکریہ"
دور جے نے آگے آکر ٹوکری کا ڈھکن کھولا اور میمنے کو نکال کر یانسکت کی گود میں ڈال دیا۔
"لو......اب سنبھال کر رکھنا......دوبارہ چھوٹا تو ہاتھ نہیں آئے گی۔"
"کاسہ لے (اچھا جی)......" میمنا کو گود میں لیا ہی تھا کہ دور جے نے ہاتھوں کو چُھو لیا۔ یانسکِت کے تن بدن میں کرنٹ سی دوڑ گئی۔ یہ تو بے ہودہ حرکت تھی۔ لیکن وہ شرما گئی۔ اور اُسی دم میمنا چھورول کو پکڑوا دیا۔
تبھی دور جے ٹوکرا اُلٹا کر میمنا کی منگنیوں کے ڈھیر بناتا فونچک چپراسی سے مذاقاً بولا۔
"لو فونچک۔ تمہاری محنت کا پھل......تمہیں بھی تو انعام میں کچھ ملنا چاہیے"
فرش پر ننھی مُنی منگنیوں کا ڈھیر دیکھ کر فضا میں ملا جُلا قہقہہ بُلند ہوا......سب ہنستے ہوئے فونچک کی طرف دیکھنے لگے۔ فونچک کھسیانا سا ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ یانسکِت کنکھیوں سے دور جے کو ٹکُر ٹکُر دیکھنے لگی۔
پھر دونوں سہیلیاں "شکریہ" اور "جولے" کہہ کر ہنستی اور چوکڑیاں بھرتی ہوئی کھیتوں کھیت لوٹ گئیں۔
شُکر ہے آج کی پکنک نے میرے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ آج نہ صرف میں نے اسکول اور رگزن جیسے شریروں کے تناؤ سے بے نیاز ہو کر سُہانے موسم کا مزہ لوٹا تھا بلکہ دور جے کے دل میں بھی یانسکِت کو پا لینے کی چاہت جاگی تھی......

باب نواں

اسکول کُھل چکا تو احاطے میں بچّے یکے بعد دیگرے جمع ہونے لگے۔
صبح کی گھنٹی بجنے میں پورے بیس منٹ کی دیر تھی۔ فونچک چپراسی ایک ایک کر کے کلاسوں کے تالے کھولنے میں لگا تھا۔
ہم دونوں معمول کی طرح دفتر میں گُھس کر کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ ماسٹر بھوشن اور گوربچن ایک دوسرے کے پیچھے تشریف لے آئے۔
"نمستے جی............"
"ست سریا کار جی............ تُسی (تُم) دونوں چنگے (اچھے) ہو جی............"
"ہاں جی۔ بالکل ٹھیک ہیں............"
ہم دونوں نے بھی اُن کی خیر پُرسی کا جواب خیر پُرسی سے دیا۔
"آپ دونوں بھی ٹھیک ٹھاک ہیں جی............"
"ہاں جی بھگوان کی مہربانی ہے............" پنڈت جی ادب سے بولے۔
"سانو (ہمیں) بھی رب دی کرِپا (مہربانی) ہے جی............" گوربچن جی بھی اُسی دم بولے۔
کچھ دیر خاموشی رہی پھر گوربچن شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔
"او جی............ پردیس میں مل جُل کر موج مستی کرنی چاہیے کہ نہیں"۔؟
"ہاں جی کیوں نہیں۔" میں نے تائید کرتے ہوئے کہا "اِس میں کیا شک ہے"۔

''تو پھیر..........اسی (ہم) بھی تو اِتھے (یہاں) بے یارو مددگار پڑے رہندے (رہتے) ہیں.....ساڑا (ہمارا) بھی تو دل اُوب جاندا (جاتا) ہے.....اوئے بلے او بلے۔ پُرا (بھائی) جیسے لوکاں (لوگ) ہیں اسی (ہم) سارے.....پھیر (پھر) الگ تھلگ پروگرام بنانا کی مانے (کیا معنے)..........اے بھی کوئی بات ہوئی..........کیوں پنڈت جی۔''میں ٹھیک اکھیانا (کہانا).....؟''

''ہاں جی گیانی جی۔آپ ٹھیک کہتے ہو۔ہمارا بھی دل ذرا کھل جاتا..........بہت دن ہوئے ڈیروں میں سڑتے سڑتے۔'' کہتے کہتے بھوشن جی مسکرا دیئے تو میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''سچ پوچھو تو ہمیں بھی آپ دونوں کی بہت کمی محسوس ہوئی۔آپ کے بناء کچھ خاص مزا نہیں آیا۔کیوں اکرم سچ ہے نا..........!''

اکرم نے معذرت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں .....قصور سارا پچھلے اُن اتواروں کا ہے۔جو خراب موسم کے اعتبار سے کبھی بھی ہمارے لئے موافق نہ رہے..........''

تبھی لاما جی اور ماسٹر دورجے ''جو لے'' کہتے ہوئے وارد ہوئے۔اور آتے ہی اُن دونوں سے کہنے لگے۔

''جناب۔آپ دونوں کو شہر جانا تھا تو ہم سے کہہ دیا ہوتا .....ہم پروگرام کینسل کر دیتے..... بڑی دیر تک آپ کے ڈیرے کے چکر یہ سوچ کر لگاتے رہے کہ کسی پاس پڑوسی کی دعوت سے لوٹ آئیں تو خبر کر دیں گے.....ہمیں تو کل صبح ہی آپ کے شہر جانے کا علم ہوا۔کسی بچے نے سنیچر کے روز چھٹی کے بعد آپ تینوں کو بس میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا..........''

''ام (ہم) تین کون..........؟''

گور بچن جی حیران ہو کر پوچھ بیٹھے تو دورجے یاد دلاتے ہوئے بولا۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تھے نا آپ کے ساتھ۔''

''ہاں ہاں جی۔ہاں جی۔مان لیا............''

ماسٹر بھوشن بات سمجھتے ہوئے بولے۔

''سچ ہے۔بھول ہماری تھی جو ہم کہہ کر نہیں گئے تھے۔''

پھر گور بچن کی طرف یوں دیکھنے لگے گویا کہہ رہے ہوں۔'بھیا گور بچن جی۔چوری کے بعد سینہ زوری اچھی نہیں۔ہار مان لو اور بات ختم کر دو۔'

گور بچن جی خاموشی سے مسکرا دیئے۔

بات ختم ہوگئی۔

دور جے ہمیں الزاموں سے چھٹکارا دلانے کے بعد میری بغل والی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے پکنک کا رومانی منظر یاد آ گیا اور میں اُسے ہاتھ سے پکڑ کر دفتر سے باہر برآمدے پر لے چلا۔

وہ میری عجیب سی حرکت پر حیرت زدہ ہونے کے باوجود چپکے سے چلا آیا۔

باہر نکل کر میں نے اُس کا دل ٹٹولنے کی کوشش میں پوچھا۔

''رات کو نیند آئی کیا............؟''

''جی ہاں آئی کیوں نہیں۔آئی جی خوب آئی۔ایسا کیوں پوچھتے ہو آپ؟''

''اس لئے کہ تمہاری آنکھوں کے خمار سے بے خوابی کی شکایت صاف چھلک رہی ہے۔ جسے صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔خوب کروٹیں بدلتے رہے ہو رات بھر...... ہے نا......''

دور جے مسکرا دیا۔پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''نہیں تو............''

''مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''بالکل نہیں۔چھپانے کی بات ہی نہیں۔''

میں نے اس کی نجی زندگی کو کھنگالنے کی کوشش کی۔

''اچھا یہ بتاؤ...... کتنے بچے ہیں تمہارے.........؟''

''ابھی تو میں کنوارا ہوں جناب.........''

''ہم م م ....یعنی کہ تمہارے یونٹ میں ویکنسی vacancy ہے۔''

''جی......مذاق کرتے ہو آپ۔''

''مذاق ہے بھی.........اور.........نہیں بھی......''

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر اُسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ اس ویکنسی vacancy کے لئے تم جس کو سائن (sign) کرنا چاہتے ہو اُس کا اندازہ ہے مجھے.........''

''کس کو سائن کرنا چاہتا ہوں.........؟''

''اس کو جو کل پکنک میں میمنا کے پیچھے بھاگی چلی آئی تھی۔''

''وہاں تو دو تھیں.........!'' اُن میں سے کون سی والی.........؟''

اُس کی بے تابی بھانپ کر میں نے کانا پھوسی کے انداز میں قریب سے پوچھا۔

''اچھا یہ بتاؤ.........تمہارے گھر والے یانسکِت کو اپنی بہو بنانے پر راضی ہوں گے......؟''

''یانسکِت......!''

یانسکت کا نام دُہراتے ہی اُس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ دل کے ارمان ستاروں کی مانند خیالوں میں ٹمٹما اُٹھے.........خوشی کی لہروں نے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر دیں۔

''کہو کہو......میری بات کا سوچ کر جواب دو۔''

''یہ آپ نے کیوں پوچھا.........؟''

''اس لئے کہ کل پکنک کے درمیان تمہارے دل سے اُٹھتا ہوا محبت کا طوفان بھانپ لیا تھا...... اور......اس لئے بھی کہ سُنا ہے کہ لداخ میں ذات پات کی زیادہ پوچھ تاچھ ہوا کرتی ہے۔''

''ہاں......سو تو ہے......ویسے میرے لئے اس معاملے میں پریشانی کی بات نہیں......

اُن کی ذات ہماری ذات سے کافی ملتی جُلتی ہے زیادہ فرق نہیں ہے............"

"مطلب یہ کہ تم دونوں کا میل ہوسکتا ہے......یعنی تم اُسے پسند کرتے ہو......؟"

"پسند تو میں پکنک سے پہلے کر چکا ہوں............لیکن مجھ اکیلے کے یک طرفہ پسند سے کیا ہوگا۔سب کچھ تو اُس کی پسند پر منحصر ہے۔"

"دل سے چاہتے ہو تو اظہار محبت کر ڈالو۔ کیا پتہ پیار کی ڈور سے بندھی چلی آئے...... ہے نا......اور یہ بھی کہوں......خوب جمے گی تم دونوں کی جوڑی............"

پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُسے زندگی کا اُتار چڑھاؤ سمجھانا ضروری سمجھتے ہوئے میں نے کہا۔

"لیکن......نصیحت کے طور پر چند باتیں ضروری ہیں۔اس لئے کہ تم جوان ہو......زندگی کے کٹھن تجربوں سے ابھی گزرے نہیں ہو............اور شاید یہ تمہاری محبت کا پہلا گیند ہے۔جسے تم کسی معصوم کے پالے میں ہٹ (Hit) کرنے جا رہے ہو ....اگر اس میں کامیاب ہوگئے۔تو ٹائم پاس کا کھلونا بنا کر نہ اپنا ضمیر داؤ پر لگانا نہ پیشے پر داغ لگنے دینا......اُستاد کا معیار بلند ہے۔اسے ہمیشہ بنائے رکھنا۔پیغمبروں اور اوتاروں کے بعد رہبری کے لئے اساتذہ کا مقام ہی بلند و بالا اور مقدس مانا جاتا ہے۔پیشے کے لحاظ سے ہم قوم کے معمار ہیں......اچھے بُرے لوگوں کی اُمید بھری نگاہیں ہر دم ہمارے نقش و قدم پر گڑھی رہتی ہیں۔انہیں انگلی اُٹھانے کا موقع کبھی نہ دینا......اور پھر وہ معصوم جو کسی کے گھر کی عزت آبرو اور شان ہے۔اُس کے ناموس سے کھیل کر کبھی اُسے اور اُس کے خاندان کو ٹھیس نہ پہنچنے دینا۔اب جو تم اُسے چاہنے لگے ہو......تو رابطہ بڑھانے کی کوشش بھی کروگے۔اگر وہ پیار کی چاہ میں کھینچی چلی آگئی تو اُس کا بھروسہ توڑ کر کبھی اُسکے ارمانوں کا خون نہ ہونے دینا............سمجھتے ہونا میری بات......"

"جی ہاں............"

"یاد رکھوا بھی وہ چھوئی موئی ہے......اور چھوئی موئی کے ساتھ زندگی بسانے کا سُکھ دنیا میں

سب سے میٹھا اور یادگاری ہوتا ہے۔ لہٰذا شادی کے پوتر بندھن میں ہی بسا لینا۔ سمجھتے ہونا......"

"جی جی.. .... سمجھتا ہوں۔"

"ورنہ گمراہی اور عیاشی کے دلدل سے کبھی نہ نکل پاؤ گے۔ اور وقت بیت جانے کے بعد زندگی پھیکی معلوم ہوگی۔"

"جی وسیم صاحب......" دورجے متاثر ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

دس بجنے کی دیر تھی کہ گھنٹی بج اُٹھی۔

میں نے اس کے کاندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے آخری بار کہا۔

"میری نصیحت ہمیشہ گرہ میں باندھے رکھنا۔ ہمیشہ مطمئن رہو گے۔"

"جی جناب.........." کہہ کر اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کی نگاہیں مجھ سے ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔ شاید وہ میری باتوں سے متاثر ہو کر مجھے اپنا رہبرِ اعظم سمجھنے لگا تھا۔

نصیحت کرنا میری پُرانی عادت تھی۔ کیونکہ اگر کوئی ایک فرد بھی میری بہتر راہنمائی سے زندگی کے سیدھی ڈگر پر چل نکلتا تو میرے لئے باعث افتخار ہوتا۔

احاطے میں صبح کی دُعائیہ کے لئے قطاریں بننے لگیں۔

قطاریں بنتے بنتے اچانک کچھ ایسا ہوا کہ بچوں کی آدھی سے زیادہ قطار ایک دوسرے پر گرتی اور لڑھکتی چلی گئی۔ انہیں سنبھالنے کے لئے آفس office سے ماسٹر صاحباں دوڑ پڑے۔

میں نے دورجے صاحب کو بھی معاملہ سنبھالنے کے لئے دوڑا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ شرارت رگزن اور چند شرارت پسند بچوں کی تھی۔

اتنے سارے اساتذہ کے ہوتے ہوئے میں صبح صبح کسی کو پیٹ کر اپنا موڑ mood بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے جان بوجھ کر آفس میں چلا گیا۔

باب دسواں

میری مت مارگئی تھی جوڈیرے کےقریبی باغیچے میں کئی پیڑوں کے مضبوط اور ترچھے تنوں پر چند بچیوں کی دل بہلائی کے لئے چپراسی فونچک کے ہاتھوں رسیاں بندھوا کر کئی جھولے بنوالئے تھے۔

سوچا تھا جھولا جھلانے کے بہانے دھیرے دھیرے اپنا پن پیدا کر کے ڈرنے والی بچیوں میں اسکول آنے کی خواہش پیدا کرلوں گا۔ان کا شوق بڑھاؤں گا۔اوراس مقصد کے لئے جان بوجھ کر جھولا جُھلانے کا وقت چار بجے کے بعد کا مقرر کر رکھا تھا تا کہ اسکول اوقات میں بچوں کی پڑھائی متاثر نہ ہوا کرے۔

یہی وجہ تھی کہ ہر شام کو اگلے دن کی چار بجے تک یعنی اسکول سے چُھٹی ہونے تک کے لئے جھولے کی رسیوں کو پیڑ سے بندھوائے رکھتا اور چُھٹی ہونے کے بعد اسکول سے آکر پہلے

جھولا کھلوا دیتا پھر اپنے ڈیرے کی راہ لیتا۔

اس طرح اسکول کے اوقات کے بعد اکثر گھنٹہ بھر گاؤں کے نئے بچو کے ساتھ رہتے رہتے کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ کئی بچے اسکول چلے آئے۔

میری کوشش رنگ لا رہی تھی۔

اکرم کو بچوں کا شور شرابا پسند نہ تھا۔ وہ باغیچے کی طرف کم ہی آیا کرتا۔ البتہ فونچک چپراسی جھولا کھولنے اور پیڑ سے باندھنے کے لئے آنے کی زحمت گوارہ کرتا رہتا تھا۔

جب تک بچیوں کے ہمراہ باغ میں رہتا۔ جھولوں پر جھولتے بچیوں کی کلکاریوں سے ترنگ بھری محفل سجی رہتی ...... اس محفل میں کئی دوشیزائیں بھی مچل مچل کر مزے لوٹتیں...... کبھی کبھار تو بے چین ہو کر چھورول اور یانسکِت بھی ہم جولیوں کے ہمراہ چلی آتیں۔ اور دوسرے بچیوں کو جُھلانے میں مدد دیتیں۔

ایک دن چھورول کو بچیوں کے بیچ تنہا پا کر میں نے کہہ دیا۔

"تم پڑھتی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا............"

"مجھے پڑھنا اچھا نہیں لگتا۔" چھورول لاپروائی سے منہ بگاڑ کر بولی۔

"تو کیا..... گوبر سمیٹنا اچھا لگتا ہے۔؟"

"گوبر تو جلانے کا کام آتا ہے نا ماسٹر جی۔"

"ہاں جلانے کے کام تو آتا ہے..... پڑھنا لکھنا بھی تو جیون سُدھارنے کے کام آتا ہے۔"

میرے سمجھانے پر نہ سمجھی اور بھولے پن سے بولی۔

"ماسٹر جی۔ جیون تو شادی کرنے سے سُدھرتا ہے.....اور پھر شادی، اَن پڑھ اور پڑھے لکھے دونوں کے ہو جاتے ہیں۔ پھر بھلا پڑھنے لکھنے کا کیا مطلب ......؟ ہم لڑکیاں تو گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ ایسا ہماری اماں لے کہتی ہیں۔"

میں اُس کی بھولی باتوں کو سُن کر سٹپٹا گیا۔ پھر سمجھاتے ہوئے بولا۔

''وہ جو پڑھ لکھ کر اُستانیاں اور ڈاکٹرنیاں بن کے شادیاں کرتی ہیں نا۔اُن میں اَن پڑھ لڑکیوں کی نسبت گھر کی ذمہ داریاں بہتر ڈھنگ سے نبھانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔اتنا ہی نہیں وہ مریضوں کی خدمت اور قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہ کر سماج میں بھی نام کماتی ہیں......انہیں سرکار کی جانب سے تنخواہ کی صورت میں خدمت کا صلہ بھی مل جاتا ہے......یہ سب دیکھ کر تمہارا من نہیں مچلتا............؟''

''ہاں جی مچلتا ہے......کبھی کبھی سوچتی ہوں پھر سے پڑھ لوں۔مگر۔۔۔؟''

''تو کیا تم پہلے پڑھتی تھی......؟''

''جی ماسٹر جی............میں صرف آٹھویں پاس کر پائی ہوں۔''

''تبھی تو اُردو بولتی سمجھتی ہو۔''

''جی......مجھے اُس رگزن کی وجہ سے پڑھائی چھوڑنی پڑی تھی۔''

''وہ تو اب نویں جماعت میں پڑھتا ہے......اس کا مطلب تم نے رزلٹ سُن کر ہی پڑھائی چھوڑی ہے......''

''جی ماسٹر جی......''

''کوئی بات نہیں۔ابھی بھی امتحان کی تیاری کے لئے پانچ مہینے کا وقت باقی ہے۔''

میں نے اُس میں دلچسپی پیدا ہوتے دیکھ کر کہا۔

''تم چاہو تو میں نویں جماعت میں داخلہ دلوا سکتا ہوں............اور ہاں اپنی سہیلی کو بھی سمجھا سکتی ہو............''

''یا نسکِت نہیں پڑھ سکتی ماسٹر جی......وہ تو بچپن سے ہی نہیں پڑھی ہے نا............اور میری تو پڑھائی میں دلچسپی رہی ہی نہیں......''

''سوچو ذرا سوچو............تم پڑھ لکھ کر کل کو استانی بن گئی تو اسکول میں کیا سارے گاؤں میں کتنا مان ہوگا......بچے تم سے پڑھ لکھ جائیں تو کتنا پُن ملے گا......سرکار سے تنخواہ

بھی ملتی رہے گی۔ اور کوئی وقت ہوگا جب تم ہیڈ ماسٹرنی بنو گی۔ تب کتنی چین سے کٹے گی تمہاری زندگی۔ ذرا سوچو۔"

میں نے اسکے سوئے ہوئے ارمان جگا دیئے تو وہ بے قرار ہو کر مچلنے لگی۔ پھر کہنے لگی۔

"لیکن رگزن کے ہوتے کیسے پڑھ پاؤں گی۔ ...؟"

اُس کے خدشے میں صداقت تھی۔ واقعی رگزن سے ہر طالب علم پریشان رہتا تھا۔

میں نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"تم پڑھنا چاہو تو اُسے میں سنبھال لوں گا۔"

"پڑھ تو لیتی .... لیکن پڑھوں کیا خاک .... سب کچھ تو بُھلا چکی ہوں......"

"کوئی بات نہیں.......... داخلہ لینے سے پہلے پڑھنے لکھنے کی مشق میں کرا دوں گا۔ اور کچھ......؟

"تب تو میں ضرور پڑھوں گی ماسٹر جی..........." وہ کھل سی اُٹھی۔

گھنٹہ بھر باغیچے میں رہنے کے بعد اُسے خیالوں میں چھوڑ کر میں ڈیرے پر لوٹ آیا۔

ابھی کمرے میں بیٹھے دس منٹ کا وقفہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ باغیچے میں چیخ و پکار شروع ہوئی۔ بھاگ کر جو دیکھا تو بچیوں کے درمیان چھورول کو چاروں شانے چت پایا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی......میں نے بچوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا...... کیا ہوا اِسے...... کیسے گر پڑی......؟"

ایک چھوٹی سی بچی رُک رُک کر توتلی زبان میں کہنے لگی۔

"ماٹر جی۔ ماٹر جی۔ یہ نا۔ جھولا پر چڑھ کرنا۔ آہشتہ آہشتہ جھولا کھاتی تھی۔ وہ رگزن ہے نا ماٹر جی۔ اُس نے آ کر زور زور سے جھولا کو دھکا دیا۔ اور ہے نا۔ رسی بھی نا...... کٹ کر گر گئی۔ اور۔ اور۔ چھورول بھی گر گئی۔"

رگزن کا نام سُنتے ہی یہ سوچ کر پریشانی کا جھٹکا لگا۔ کہ وہ بد بخت اب یہاں بھی اشانتی پھیلانے آن پہنچا۔ میں غصے میں چلاّیا۔

"کہاں گیا وہ بدمعاش......؟"

"وہ تو......اُسی وقت بھاگ گیا ماٹر جی۔"

"خیر بچ کے کہاں جائے گا......دیکھ لوں گا اُسے......لیکن بچیو......" میں نے منع کرتے ہوئے کہا۔ "تم رگزن کی اس حرکت کے بارے میں کسی سے مت کہنا۔ سمجھے نا......میں خود اس کی خبر لوں گا......"

بچوں کو منع کرنے کے بعد میں فوراً ہی جُھکا اور اُسے ہوش میں لانے کی سعی کی۔ ہلایا جُھلایا۔ آنکھیں ٹٹولیں .. ... اُسکی ہتھیلیوں کو سہلاتے ہوئے آوازیں دیں۔

"چھورول......اے چھورول......آنکھیں کھولو......آنکھیں کھولو۔ تم ٹھیک تو ہو نا......؟"

لیکن وہ بے سُدھ پڑی رہی۔

میری مت ماری گئی تھی......جو بڑی لڑکیوں کو جھولے میں چڑھنے سے منع نہیں کیا تھا...... ورنہ یہ حادثہ نہ ہوتا......اب یہ سوچ کر پریشانی ہونے لگی کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو لوگ الزام دھریں گے..........من گھڑت باتیں بنائیں گے......اس سے پہلے کہ کچھ ہو جاتا نیم مردہ چھورول کو بازوں میں اُٹھا کر نیچے ڈسپنسری کی طرف بھاگا......ساری بچیاں ہمراہ چلی آئیں۔

مجھے یقین تھا کہ کچھ دور چلنے کے بعد اُسے ہوش آجائیگا۔ اور ہوا بھی یہی......شاید اُسے ہوش آ گیا تھا۔ کیونکہ ایک پل کے لئے اُس کی آنکھیں کُھلنے اور بند ہونے کی جھلک میں نے گمان کی حد تک دیکھ لی تھی۔ اب شاید اُس نے مردانہ لمس کے احساس سے شرما کر فوراً ہی آنکھیں بند کر کے خود کو بے ہوش جتلانے میں عافیت سمجھی ہو۔ یا پھر سچ مُچ ہوش ہی نہ آیا ہو۔ بہر حال میں شش و پنج میں مبتلا رہا۔ اور ان ساری باتوں کو اپنا وہم سمجھ کر ڈسپنسری کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

میرے بازوں میں نیم مردہ سی جان جھولتی دیکھ کر ڈاکٹر، کمپونڈر اور اُن کے اسسٹنٹ یک لخت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دوشیزہ کو بیڈ پر ڈالنے کا اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بولے۔

''کیا ہوا اسے ماسٹر جی ....؟''

میں نے اُسے بیڈ پر ڈالتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

''جھولے سے گر پڑی تھی۔''

انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

''کسی پتھر پر تو نہیں گری؟''

''جی نہیں۔ نیچے سبزہ زار تھا۔ لمبی لمبی گھاس تھی۔''

''اونچائی کتنی رہی ہوگی جھولے کی ....؟''

''تھوڑی ہی ...... یہی کوئی تین چار فٹ ہوگی۔''

ڈاکٹر صاحب نے سٹیتھسکوپ سے stathesticope سے بھرپور معائینہ کرنے کے بعد معاملہ بھانپتے ہوئے کہا۔

''پریشان ہونے کی بات نہیں۔ بھگوان نے چاہا تو ایک ہی انجکشن سے اُٹھ کھڑی ہوگی۔''

سوئی کی بات سُنتے ہی وہ گھبرا کر اچھل پڑی اور ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھتی ہوئی چیخی۔

''اُوئی باب رے .... نہیں نہیں ...... میں سوئی نہیں لگواؤں گی۔''

اُسے اچانک اس طرح اُٹھ بیٹھتے دیکھ کر سبھوں کی ہنسی چھوٹی۔ بڑے تو بڑے چھوٹے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میں بھی ہنسا۔ میری تو جان میں جان آ گئی۔ ساری بچیاں خوش تھیں۔

ڈاکٹر صاحب چھوروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہنس کر بولے۔

''شی از آل رائٹ ناو. She is all right now اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''تھینکس۔ مینی مینی تھینکس ڈاکٹر۔ مے وُی گو ناو'' میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

''Thanks, many many thanks Doctor, May we go now? اجازت ہو تو چلتے ہیں۔''

''او، یس۔O Yes۔اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے''۔

''گڈ ایوینگ سر Good evening sir''

''گڈ ایوینگ۔ وِش یو آل دی بیسٹ۔wish you all the best''

''ڈاکٹر صاحب نے پُرخلوص انداز میں نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کیا اور ہم چل دیئے۔

سامنے کی پگڈنڈی پر سے نمبردار اور اُس کی بیوی گھبرائے ہوئے بھاگے چلے آرہے تھے۔ قریب پہنچتے ہی رُکے۔ میں نے دِلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''نمبردار جی پریشان نہ ہوں۔ اب چھورول بالکل ٹھیک ہے۔''

''جی ماسٹر جی۔ ہم تو ڈر گیا تھا۔ سُنا تھا جھولا سے گر گیا ہے۔''

''ہاں۔ بچوں کا جھولا ہے.......... رسیاں کمزور ہیں۔ چھورول کا وزن اُٹھانے کے لایق نہیں تھیں...... خیر اب اسے پتہ چل گیا ہوگا۔ آئندہ نہیں چڑھے گی........... آیئے لوٹ چلتے ہیں۔''

چلتے چلتے میں نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

''نمبردار جی۔ ایک بات بتایئے..... آپ مُکھیا ہیں۔ گاؤں کے سب سے سمجھدار آدمی ہیں۔ ہے نا۔''

''تھوڑا تھوڑا ہے ماسٹر صاحب۔ ہم تو ان پڑھ آدمی ہوں۔''

''جو بھی ہو.......... گاؤں کی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں نا آپ..................؟''

''وہ تو ہے ماسٹر لے۔''

''تو پھر کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ دوسروں کی بچیاں پڑھتی جائیں اور آپ کی بچی دن بھر گھومتی پھرے یا پھر صرف گھریلو کام میں اُلجھتی رہے...... زمانہ بدل چکا ہے نمبردار جی۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی پڑھانا ضروری ہو گیا ہے...... پڑھ لکھ کر نوکری نا بھی کرنا چاہے تو کم از کم اپنی اولاد کو گھر میں پڑھا پائے گی۔ بچوں کو اچھی تربیت ملی تو دُنیاداری کے لایق بنیں گے۔ اچھے بُرے اور نفع نقصان کی تمیز کر پائیں گے ۔ اور تو اور۔ آپ کی بچی نہ صرف ڈنگروں

مال مویشیوں کی بہتر ڈھنگ سے دیکھ بھال کر سکے گی ۔ بلکہ زراعت کے معاملے میں بھی سائنسی طور طریقے اپنانے میں ماہر ہوگی۔"

"جی ماسٹر جی۔ آپ بالکل ٹھیک بولتا ہوں............ہم نے چھورول کو بہت سمجھایا۔ مگر وہ مانتا نہیں ہے جی۔ بالکل نہیں مانتا ہے جی۔"

"اب مان جائے گی......میں نے سمجھا دیا ہے۔ صرف آپ روکیئے مت۔"

"حَی (ہائے) پھر تو خوشی کا بات ہے ماسٹر صاحب۔ ہم نی (نہیں) روکے گا...... بالکل نی (نہیں) روکے گا۔"

اتنا کہہ کر نمبردار نے بیٹی کو بھرپور نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ چھورول نے سر کو اقرار میں جنبش دے کر پڑھنے کی حامی بھر لی۔

بیٹی کا اشارہ پا کر نمبردار اور اُس کی بیوی پھولے نا سمائے۔

چلتے چلتے ہمارا ڈیرا آ گیا۔

اکرم ڈیرے کی چھت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

چھورول کے گرنے کی خبر سے اُسے بھی تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اب اُس کو بھلا چنگا دیکھ کر مطمئن تھا۔

جھولے کے رسے پیڑ سے لپیٹے جا چکے تھے۔

باب گیارواں

سطح سمندر سے ہزاروں فٹ کی بلندی کے باوجود سہ طرفہ پربتوں کے درمیان بسے اس گاؤں کی بنجر اراضی کو پرانے وقتوں کے محنت کش لوگوں نے کن کن دشواریوں کے باوجود زرخیز بنانے میں کامیابی حاصل کی ہوگی اس کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں۔ وہ لوگ واقعی جفاکش، بلند حوصلہ اور منصوبہ سازرہ چکے ہوں گے۔ تبھی تو ثابت قدم رہ کر اپنی آئندہ نسلوں کے لئے زرخیز کھیتوں کی صورت میں سب سے قیمتی سرمایہ چھوڑ گئے۔

یہ زرخیز کھیت اور پھل دار پیڑ پودے نہ صرف گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کا سرمایہ تھے بلکہ گاؤں کی رونق اور نزاکت سب اسی کے دم سے قائم و دائم تھی۔ تہہ دار کھیتوں نے پورے علاقے کو جاذب نظر اور پُرکشش بنا کر نزاکت میں بھرپور اضافہ کر دیا تھا۔

اُس پر کبوتروں کی غٹرغوں کی آوازیں، پنچھیوں کی چہچہاہٹ، چکوروں اور رام چکوروں کی دل کو لبھانے والی ترنم ریز سیٹیاں، دلآویز پروازیں گاؤں کی شان میں ایسا چار چاند لگاتی

رہیں کہ سب کچھ من کو خوب بھاتا رہا۔

چھورول میرے ڈیرے پر پڑھنے کے لئے مہینے بھر سے باقاعدہ آنے لگی تھی۔ وہ آ کر نہ صرف پڑھ لکھ جاتی بلکہ چاول دالیں صاف کرنے میں بھی ہاتھ بٹاتی۔ آلو، پیاز اور دیگر ترکاریاں بھی چھیل کتر کر دے جاتی۔

ڈیرے پر باقاعدہ اور مسلسل آتے رہنے کے سبب مجھ سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ تکلّف کی حدیں پار کر گئی اور میرے ساتھ بے باکی سے پیش آنے لگی۔ کبھی کبھار تو رومانی انداز میں بے جھجک کچھ بھی ایسا پوچھ لیتی کہ میں دانتوں تلے انگلی دبانے پر مجبور ہو جاتا۔

کبھی کہتی۔

''ماسٹر جی۔ سارا کام آپ کو خود کرنا پڑتا ہے۔ آپ کوئی انتظام کیوں نہیں کر لیتے۔''

کبھی کہتی۔

''میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں ہی آپ کی دیکھ بھال کر لیا کروں۔''

اور کبھی کہتی۔

''کاش! میں بھی آپ کے ڈیرے میں رہ پاتی''۔

اُس کی باتوں سے میرے پسینے چھوٹ جاتے............اسلئے کہ یہ باتیں ہلکی پھُلکی نہ تھیں۔ سمجھنے والوں کے لئے ان میں زندگی بھر کا مطلب چھپا تھا۔ ایک پیام تھا جو دل کی حالت کا پتہ دیتی تھی۔ چھورول کی ان ہی بے تکی باتوں سے گھبرا کر ا کرم کمرے میں نہ ٹکتا تھا۔ اور اُس کے آتے ہی بھاگ کر کمرے کی چھت پر چلا جاتا تھا۔ اب مجھے بھی چھورول کے انداز تکلم سے ڈر لگنے لگا تھا۔

کبھی کبھی تو حد ہی ہو جاتی۔ پڑھتے پڑھتے جان بوجھ کر اتنی قریب آ جاتی کہ سانسوں کے ٹکرا جانے کا احساس دل کی رفتار کا توازُن بگاڑ کر مجھ میں ایسی ہیجانی کیفیت طاری کر دیتی کہ بے خود سا ہونے لگتا......لیکن اس سے پہلے کہ کوئی بے تکی بات ہو جاتی۔ میرے

زندہ ضمیر کا جھٹکا مجھے جھنجھوڑ کر سنبھال لیتا۔ اور میرے ٹوکنے پر چھورول چنچل لڑکیوں کی طرح شوخی سے ہنس دیتی۔

گاؤں کے لوگ اسکول کے بچے سبھی اُسے بے دھڑک ہمارے ڈیرے پر آتے دیکھ دیکھ کر حیران تھے۔ شاید چھورول کی ناسمجھی کی وجہ سے کبھی کبھی ہمارے بارے میں غلط رائے بھی قائم کرڈالے ہوں۔ پھر بھی میرے لئے قابل اطمینان بات یہ تھی کہ اُس کے بڑوں نے کبھی بھی کسی قسم کا اعتراض نہ جتایا۔ نہ شکایت کی۔ نہ اُس پر روک لگانے کے لئے پہرہ بٹھایا۔ بلکہ ہمیشہ میرے ساتھ زندہ دلی سے پیش آتے رہے۔ وہ میری شرافت پر بھروسہ کئے جارہے تھے۔ اور میں بھی وقتی عشق میں ڈوب کر کسی کے ضمیر کو ٹھیس پہنچانے کے حق میں نہ تھا۔ اُستاد اور شاگرد کے تقدس کو بنائے رکھنا مقدس پیشے کے اعتبار سے میری اولین ذمہ داری تھی۔

اپنی جانب سے محتاط رویے کے باوجود اُس کے انداز بدستور قاتلانہ رہے۔ وہ بظاہر شوق سے پڑھتی۔ لیکن کبھی کبھار نوک جھونک پر بھی اُتر آتی۔ ایک دن بے ساختہ بولی۔

''ماسٹر جی۔ جس دن آپ کا تبادلہ کشمیر ہوگا میں بھی چلی آؤں گی۔''

میں اُس کے انداز تکلّم پر چونک پڑا۔ میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ میں نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

''پڑھتے پڑھتے ہی تم پر بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ اِس کو پڑھائی نہیں کہتے۔ ایسی بے ہودہ باتیں کرتی رہوگی تو میں پڑھانا چھوڑ دوں گا۔ اور تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ نویں جماعت کا امتحان پاس کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

''لیکن ماسٹر جی مجھے کشمیر دیکھنے کا بہت شوق ہے''۔

''تو چل لینا۔ مگر ابھی تو پڑھ لو۔ چند دنوں بعد اسکول میں داخلہ لینے جارہی ہو۔ وہاں کچھ کر دکھاؤ گی تو سبھی خوش ہوں گے۔''

''مجھے سب کی خوشی سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرے لئے تو صرف آپ کی خوشی بہت ہے۔''

"وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اسکول میں پڑھانے والے خوش ہوں گے۔ تمہارے ابالے، اماں لے اور بڑے خوش ہوں گے۔ تو مجھے بھی خوشی ہوگی۔"

"لیکن میں تو کشمیر جاؤں گی۔ وہ بھی آپ کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے میرے ساتھ چل لینا۔ لیکن ابھی تو پڑھ لو۔"

دوسرے ہی لمحے کچھ یاد کر کے چھورول بچّوں کی طرح اچھل پڑی۔ میں نے ٹوک دیا۔

"اب کیا ہوا۔"

وہ ذرا قریب آ کر دھیرے سے بولی۔

"ایک گرما گرم خبر لائی ہوں۔ بڑے مزے کی خبر ہے۔"

"تو جھٹ سے سُنادو۔ تجھے تو ہضم ہونے والی ہی نہیں۔"

"کیا کروں ماسٹر جی۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"اچھا اب پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ سیدھی سیدھی کہہ ڈالو۔"

"تو سُنیئے ....وہ یانسکت ہے نا۔"

"ہاں ہاں ....کیا ہوا اُسے۔؟"

"وہ غائب ہو چکی ہے۔"

"تو..؟"

"تو کیا۔"

چھورول دھیمی آواز میں سمجھاتی ہوئی بولی۔

"وہ کسی کے سنگ بھاگ چکی ہے۔"

"بے سر پیر کی باتیں نہ کیا کرو۔ ایسی باتیں تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ تم صرف پڑھائی پر دھیان دو بس۔"

"تین دیوتاؤں کی قسم سچ کہتی ہوں۔ آخر اُس کی سہیلی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے

سے دل کی باتیں تھوڑے نا چھپاتے تھے۔"

چھورول کے منہ سے یانسکت کے بارے میں سُن کر مجھے دورجے کا خیال آ گیا۔ میں بے قرار ہو اُٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ازدواجی زندگی کے لئے اُس کا انتخاب کر چکا ہے۔اس بارے میں سُن کر جانے اُس پر کیا بیت رہی ہوگی...... میں نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔کس کے سنگ بھاگی ہے؟"

"ماسٹر جی۔" وہ شوخ ادا کے ساتھ بولی۔"پہلے یہ پوچھو کہ کب بھاگی ہے۔"

"اچھا بتاؤ کب بھاگی ہے..........."

"کل شام سے غائب ہے۔" اُس کا لہجہ اب بھی سرگوشیانہ تھا۔ کہنے لگی۔"اُن کے ابا لے نے گاؤں میں بہت تلاش کروایا۔اوپر نیچے آدمی دوڑائے۔لیکن گاؤں میں ہوتی تو ہی ہاتھ آتی نا۔"

"تو کہاں گئی ہے۔کِس کے سنگ بھاگی ہے۔تمہیں تو کچھ پتہ ہوگا ہی۔"

"بہت کچھ پتہ ہے۔لیکن آپ نے کسی سے کہہ دی تو............!"

"میں ایسی باتوں کا تذکرہ عام خام میں نہیں کیا کرتا..........."

"تو ٹھیک ہے"

وہ کان کے قریب آ گئی اور دھیرے سے بولی۔

"یانسکت ایک ملازم کے ساتھ بھاگی ہے۔اُس نے دو دِن پہلے بتایا کہ کچھ دن پہلے ماسٹر دورجے کی طرف سے رشتہ آیا تھا لیکن گھر والوں نے انکار کر کے لوٹا دیا۔"

"یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔شاید یانسکت کے انکار کرنے پر لوٹا دیا گیا ہو..........."

"نہیں ماسٹر جی.......... بے چاری سے تو کسی نے پوچھا ہی نہیں۔پوچھتے تو فٹ سے ہاں کہہ دیتی۔کیونکہ وہ بھی دل ہی دل میں اُسے کافی دیر سے چاہنے لگی تھی۔ایسا پڑھا لکھا، کماؤ اور بانکا جوان بھلا کسے پسند نہ ہو۔"

"اچھا رہنے دو ان باتوں کو۔ایسی باتیں تمہیں شوبھا نہیں دیتیں۔"

"سُنئیے نا ماسٹر جی۔اُن کے بھاگ جانے کی سکیم پرسوں شام کو اسکول کے پچھواڑے میں طے ہوئی تھی۔وہ خود وہاں ملنے گئی تھی......اُن کے وعدے وفا وہیں ہوئے......اب دونوں مرتے دم تک خوشیوں بھری زندگی گذاریں گے۔"

"بس رہنے دو چھورول۔بہت ہو چکا۔"

میرے منع کرنے کے باوجود وہ کانا پھوسی کے انداز میں بولی۔

"وہ تو بھاگ چکی۔ایک دن میں بھی کسی کے سنگ نکل بھاگوں گی۔"

"چل...... بے حیا............ بے شرموں کیطرح باتیں نہ بنا۔اس طرح من میلا کرنے سے بھٹکنے میں دیر نہیں لگتی۔سمجھی۔"

"ماسٹر جی میں تو گاؤں کی گھٹن سے نکل کر شہر کی کُھلی فضاؤں میں جینا چاہتی ہوں۔"

اُس کی نادانی پر مجھے ہنسی آگئی۔میں نے جل بھُن کر پوچھا۔

"کیوں کیا رکھا ہے شہر کی فضاؤں میں۔کوڑے کرکٹ اور گند سے بھرے شہر میں آلودہ فضائیں ایسی ہیں کہ دم گھٹنے لگتا ہے............لوگوں کی مصروفیات اتنی ہیں کہ اپنوں کے لئے فرصتیں نہیں ملتیں۔بس یونہی جیے جاتے ہیں سبھی بے چین اور پریشان سی زندگی لے کر...... مغل باغات اور کُھلے مرغزاروں جیسے قدرتی نظارے تو بے شمار ہیں۔جن میں اوبے ہوئے تھکے ماندے مسافر پل بھر ستانے کے لئے ٹھہر جائیں تو جنت الفردوس کا سا مزہ پالیں۔ مگر سب پر حکومت کی بندشیں لگ چکی ہیں تنگ دستی کا مارا غریب پریوار بنا ٹکٹ ان تفریحی مقامات کا مزہ لینے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔لوگ اپنے ہی شہر میں ٹورسٹوں کی طرح بیگانے ہو کر رہ گئے ہیں۔تم بے کار میں شہروں کی بات کرتی ہو۔تمہارے گاؤں کے پُر فضا ماحول میں جو سکون اور شانتی ہے نا۔وہ اب شہروں میں نہیں ملتا............اس لئے بہتر ہے تم اوٹ پٹانگ باتیں کرنا چھوڑ دو۔شہر دیکھنے کا شوق ہے تو پڑھائی مکمل کرنے کے

بعد ضرور دیکھ لینا۔"

"ہاں میں ضرور دیکھوں گی ماسٹر جی......مگر دیکھوں گی تو کسی کے سنگ ہی دیکھوں گی۔"

اُس کی آنکھوں میں شوخ انگارے تیرتے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔اس سے پہلے کہ اور کوئی بے تکی بات ہو جاتی۔میں نے کتابیں سمیٹ کر جانے کے لئے کہا۔

"اچھا۔اب تم جاؤ..........دیر ہونے لگی ہے۔"

"جی ماسٹر جی۔آپ کہیں تو چلی جاتی ہوں ......ورنہ سچ تو یہ ہے کہ باتیں ابھی ختم ہوئی ہی نہیں۔"

"نہیں نہیں......بہت ہو گئیں باتیں......اب تم جاؤ بس۔"

"جی اچھا۔"

کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑی ہی تھی۔کہ میں نے مزید کہا۔

اور ہاں چھورول.........."

"جی ماسٹر جی..........کہئے۔" وہ جیسے میری آواز کی منتظر تھی۔ٹھٹھک کر رُکی۔

"کل تم میرے پاس آخری بار پڑھنے آؤ گی۔"

"کیوں ماسٹر جی..........؟"

"اس لئے کہ پرسوں تمہارا داخلہ ہوگا......"

"لیکن ماسٹر جی۔آنا جانا تو لگا ہی رہے گا نا۔میں آپ کے کام کر دیا کروں گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔لیکن داخلے سے پہلے چند باتیں سمجھنا ضروری ہیں۔سو میں کل صبح سمجھا دوں گا۔تم ٹھیک آٹھ بجے آجانا..........سمجھی نا۔"

"جی ہاں ماسٹر جی۔"

"اب تم جا سکتی ہو.........."

داخلے کی بات سُن کر وہ خوشی کے مارے خیالوں کے دوش پر پرواز کرنے لگی۔اور ایک ہی

آن میں تیر کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

چھورول میں اتنی خاصیت تو تھی ہی کہ میرے ہر حکم پر فرمانبرداراں کی طرح فوراً تعمیل کر لیا کرتی۔وہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔کچھ مُدّت پڑھائی چھوڑے رکھے جانے کی وجہ سے ذرا باولی ہوگئی تھی۔ذہن پر بے باکی کا جنون حاوی ہو چکا تھا۔تبھی تو اُستاد اور شاگرد کے حد کا فرق کرنا بھول گئی تھی۔یہ صورت حال میرے لئے ہر لحاظ سے سنگین اور پریشان کُن تھی۔سکول میں داخلے کے بعد کہیں وہ میرے لئے دردسر نہ بنے۔اس لئے داخلے سے پہلے اُس کے باولے پن کا علاج ضروری تھا۔تاکہ درس وتدریس کے مقدس پیشے پر دھبہ لگنے کے سارے خدشات ختم ہو پاتے اور میں ایک بااعتبار اُستاد کی طرح اُسے کامیابیوں کی طرف بڑھا سکتا۔اُسے خوابوں کی دُنیا سے نکل جانے میں مدد دے پاتا..........اُس کے جاتے ہی ماسٹر اکرم چھت سے اُتر آئے۔اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"بلا ٹل گئی کیا..........؟"

"جی ہاں ٹل گئی..........جان کا روگ بنی رہتی ہے......نا سمجھ ہے نا۔ہم احتیاط نہ برتیں تو خدا کی پناہ..........کچھ بھی ہوسکتا ہے۔آئندہ آنے سے منع کردوں گا۔"

باب بارھواں

سورج دن بھر کی سفر کے بعد مغربی چوٹیوں کے پیچھے نصف سے زیادہ اُترا ہی تھا کہ شام کے سائے کھیتوں تک اُتر آئے۔ پرندوں نے اُڑ اُڑ کر آشیانوں کو لوٹنا شروع کیا۔ پیڑوں کی ڈالیوں پر پنچھیوں کے بے ہنگم شور نے ساز کی طرح مسلسل بج کر محفل سنگیت جیسی دھوم مچادی۔

کمرے سے نکلنے کے بعد چھورول ان پیڑوں کے درمیان سے خیالوں کے تانے بانے بُنتی چلتی گئی۔ اُس کے دل میں ایک طوفان تھا جو بے قرار کیئے دے رہا تھا۔ یہ بے قراری اسے مسلسل ستائے جا رہی تھی۔ یا نسکت کی سرکشی سے اُس پر عجیب وغریب خیالات حاوی ہونے لگے۔ ذہن میں بے تکی باتوں کا عجیب سا پُر فریب گچھا تھا جس میں وہ اُلجھتی جا رہی تھی۔ تبھی کسی کی بے سُری آواز پر چونک پڑی۔ کوئی بھدی سی آواز میں گُنگُناتا چلا آ رہا تھا۔ جوں جوں وہ قریب آتا گیا اُس کی آواز جانی پہچانی معلوم ہونے لگی۔ ابھی وہ آواز پر غور کر ہی رہی تھی کہ پیڑوں کے درمیان سے گُنگناتے آنے والا صاف دکھائی دیا۔ یہ کوئی اور نہیں رگزن تھا۔ جانے کس کام سے گھر سے نکلا ہوگا۔ اُسے دیکھ کر چھورول یہ سوچ کر گھبرا گئی کہ نہ جانے اب کیا سلوک کر بیٹھے۔ کس طرح پیش آئے لیکن دل میں یہ بھی تہیہ کرلیا۔ کہ اُس کے سامنے سے چُپکے سے نکل جائے گی۔

رگزن قریب پہنچا تو شرارتی انداز میں گنگناتے اور سیٹیاں بجاتے اُس کے مدِ مقابل کھڑا ہو کر راستہ روک دیا۔ چھورول خاموش رہی۔ غصہ آنے کے باوجود کوئی مزاحمت نہ کی۔ رگزن نے کنکھیوں سے دیکھتے اور سیٹی بجاتے ہوئے اُس کے گرد خراماں خراماں چند چکر کاٹے۔ وہ بھی کنکھیوں سے دیکھتی رہی۔

آخر رگزن رُکا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ہُم مم۔ تو کھچِل پا کے پاس پڑھنے گئی تھی۔؟''

لداخی زبان میں کھچِل کشمیر کو اور کھچِل پا کشمیری کو کہتے ہیں۔

''میں تو مہینے بھر سے جاتی ہوں۔'' چھورول نے جواب دیا۔

''ہوں.......... بڑا شوق جاگا ہے پڑھنے کا......!''

''ہاں۔ اب اسکول میں داخلہ لے کر خوب پڑھوں گی۔''

''ہُم مم۔'' اُس کے اندازِ بیان میں شرارت اور فتور دونوں سمٹ آیا۔ بولا۔ ''خوب پڑھو گی...... پھر کون سا تیر مار لوگی۔''

''یہ کیا کہتے ہو............''؟

وہ گھبرا سی گئی۔

رگزن کا تیور جارحانہ اور اندازِ تکلم طنزیہ تھا۔

''میرے ہوتے ہوئے تجھے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے............؟ تمہارے لئے میں جو پڑھ رہا ہوں۔''

''کیا اناپ شناپ بکتے ہو۔ ہوش ٹھکانے ہیں تمہارے۔؟ چھنگ تو نہیں پی رکھی تم نے......!''

''تُجھے کیا لگتا ہے جانِ من......؟''

پھر قریب آ کر اُس کے ناک پر سانس چھوڑ کر سونگھتا ہوا بولا۔

''لو جانچ کر بولو۔ پی رکھا ہے کیا میں نے......''

چھنگ کی بُو کا ایک بھبکا اُس کے نتھنوں سے ٹکرایا تو فوراً ناک سکیڑ کر بولی۔

''ہاں تم نے پی رکھی ہے۔ اسی لئے بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو۔''

''اری میں نے صرف چکھنے کے لئے پی لی تھی۔''

''تبھی تو بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔''

''ارے نا بابا نا۔ چھنگ کو دوش نہ دو چھورول۔ میں تو تجھے دیکھ کر بن پیئے بھی بہکتا رہتا ہوں......اور تم تو ایسے کہتی ہو جیسے تمہارے گھر میں نہ چھنگ بنتی ہے نہ تم اور تمہارے گھر کے افراد پیتے ہیں۔ بولو پیتے ہیں کہ نہیں............؟''

چھورول خاموش رہی۔ چھنگ تو واقعی اُس کے گھر میں بھی بنتی تھی بلکہ تمدّن کے لحاظ سے لگ بھگ ہر گھر میں بنتی تھی۔ شادی بیاہ کی خوشی یا کسی کے موت کا غم منانے کے لئے چھنگ کا چلن تقریباً ہر گھر میں عام تھا۔ اس کے بغیر تو صاحب خانہ کی حیثیت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور تو اور......جاڑے کے موسم سے بچنے کے لئے بھی چند لوگ اس کے استعمال کو ضروری سمجھتے تھے۔

رگزن نے ٹہوکا دے کر کہا۔

''چُپ کیوں ہو جواب دو۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔

''دیکھو جانے دو...... مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

''ہاں ہاں چلی جانا۔ اچھا یہ بتاؤ وہ چھپکلی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ کہاں گئی ہے''؟

''کیوں......شادی بنانے کا ارادہ تھا کیا۔ وہ تو کب کی پُھر ہو گئی۔''

''پُھر ہوتی ہے تو ہونے دو۔ میں نے یونہی پوچھ لیا تھا......تمہارے ہوتے ہوئے وہ میری دُلہن کیوں بنے۔''

''تجھے زیادہ چڑھ گئی ہے شاید۔ مجھے جانے دو۔''

"ارے جان من۔ ایک دن تو میرا ماما میرے لئے تجھے مانگنے تیرے گھر آ ہی جائے گا۔"

"تم ایسی اناپ شناپ بکتے رہے تو ابا لے سے شکایت کردوں گی۔"

"نا بابا نا۔ ابھی سے نہیں۔ ابھی کیا جلدی ہے۔ تب میں خود ہی کہنے کے لئے اشارہ کردوں گا۔"

"بےشرم موالی۔" چھورول غصے میں بولی۔ "بکواس کرتا ہے۔"

"نہیں جان من۔ سچ کہتا ہوں۔ تب میں کہہ دوں گا نا۔"

"تُو اصلی چھٹا ہوا موالی ہے۔"

وہ ایک ہی دوڑ میں نکل بھاگی اور بھاگتی چلی گئی۔

رگزن اُس کی طرف منھ کر کے کچھ دیر دیوانوں کی طرح قہقہہ لگاتا رہا۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو دوبارہ اپنی بےسُری دُھن میں گنگناتا آگے بڑھ گیا۔

چل چنچل من تاب کیئے تو
اِک دن کھچ کے چلی آئے گی
پیار کے منکے جاپ کیئے تو
دل کی مُرادیں بھر آئیں گی

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ مدھم پڑ چکی تھیں۔ رگزن نے اپنی اوچھی عادتوں سے مجبور ہو کر ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا اور ڈالیوں پر اس طرح دے مارا کہ کئی پرندے ہڑ بڑا کر اُڑ گئے اور نئے بسیرے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے .... اب ان ننھی سی جانوں کو دوبارہ آشیانہ ڈھونڈ نکالنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس بات سے بےپرواہ ہو کر وہ اپنی بےسُری دُھن میں گنگناتا چلتا بنا۔

باب تیرھواں

گذشتہ شام ایک سورج دن بھر کی مسافت کے بعد مغربی پہاڑوں کے عقب میں اُتر چکا تھا۔ اور ایک سورج آج مشرقی پہاڑوں کے پیچھے سے پوری تابانی کے ساتھ نیلے نیلے آسمان پر جلوہ گر ہوکر منزلوں کی تلاش میں چل پڑا تھا۔

دُنیا کے ہر کونے میں نابیناؤں کو چھوڑ کر باقی سارے لوگ سورج کے آنے جانے کے چکر کو ضرور دیکھتے اور محسوس کرتے ہوں گے۔ لیکن نمبردار کی بیوی کی طرح شاید ہی ایسی کوئی نا سمجھ ہوگی جو سورج اور چاند کے بارے میں یہ جاننے کے لئے بیتاب رہتی ہوگی کہ اُس کے پیدا ہونے کے بعد سے آج تک کتنے سورج مشرق سے اُبھر کر مغرب میں پہاڑوں کے پیچھے اُتر چکے ہیں۔ اور اُتر کر گئے تو کہاں گئے۔

ایک بار اُس نے نمبردار سے بھی جاننے کی کوشش کی تھی تو نمبردار نے پیلے دانتوں کی نمائش کرکے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''کسی بُدھی مان سے پوچھ کر ہی جواب دوں گا۔''

ہر روز کی طرح آج بھی صبح صبح نمبردار خاردار جھاڑیوں سے گھیرے اپنے گھر کے آنگن میں دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے خراماں خراماں ٹہلنے میں مصروف تھا۔ اُس کی جورو ناند میں بیمار بچھڑے کو دانا چارہ ڈالنے کے بعد مکان کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

نیلے آسمان پر سورج کسی ہیرے کی مانند جھلملاتا ہوا دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ سورج کا منظر دیکھ کر نمبردار کی بیوی لاڈول بے قرار ہوگئی۔ اُس کے ذہن پر وہی سوال کچوکے لگانے لگا تو نمبردار سے بولی۔

''اے گوباجی (نمبردار جی)..........میرے دماغ میں اُٹھنے والے سوال پر تم نے کبھی

دھیان نہیں دیا۔"

نمبردار اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ پھر پوچھا۔

"کون سے سوال کا جواب پوچھا تھا تم نے............؟"

"یہی رے۔ کہ روز ایک نیا سورج یہاں سے اُبھر کر وہاں اُن پہاڑوں کے پیچھے چلا جاتا ہے......اتنے سارے سورج آتے کہاں سے ہیں......اور جاتے کہاں ہوں گے......؟ اور کیا اِن پہاڑوں کے پیچھے سورج کے گولوں کا ڈھیر نہ بن چکا ہوگا۔"

"اری چھورول کی اماں۔" نمبردار نے اناڑیوں کی طرح دیدیں نچاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم بھی اِدھر ہی ہو میں بھی یہیں ہوں۔ پھر بھلا بتاؤ مجھے کیسے پتہ ہوگا............"

"ارے کیوں پتہ نہیں ہوگا............تم مرد ہو۔ کبھی کبھی کسی کام کے لئے سامنے والے پہاڑوں کے پیچھے جاتے ہو......کبھی یاک مویشی لانے کے لئے دوسری طرف کے پہاڑوں کے پیچھے بھی جاتے ہو۔ جب جب تم دونوں طرفوں میں جاتے ہو۔ تب تب وہاں کچھ نہ کچھ تو نظر آتا ہوگا ہی نا۔"

"ہاں نظر تو آتا ہے۔"

نمبردار نے مشرقی پہاڑوں کی طرف منہ کر کے کہا۔

"میں نے ان پہاڑوں کے پیچھے اور بھی کئی پہاڑ دیکھے ہیں۔"

پھر مغربی پہاڑوں کی طرف منہ کر کے بولا۔

"اِن پہاڑوں کے پیچھے بھی کئی پہاڑ دیکھے ہیں۔ یعنی کُل ملا کر پہاڑوں کے پیچھے اتنے پہاڑ دیکھے ہیں کہ سورج کے گولوں کا کہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے گولے پہاڑ کے پیچھے اُتریں اور غائب ہوتے جائیں۔"

بیوی کی باتیں سُن کر نمبردار نے نادانوں کی طرح جواب دیا۔

"اس پر تو لاڈول میں نے کبھی غور کیا ہی نہیں۔"

''ارے بابا تم گاؤں کے گوبا (نمبردار) ہو۔لوگ تجھے بُدھی مان سمجھتے ہیں۔ تمہیں تو اس پر بھی غور کرنا چاہیئے۔کوئی کبھی پوچھ لے تو کیا جواب دو گے۔''

''ہاں سوتو ہے۔اِس پر غور کرنا ہی پڑے گا۔''

''ارے گوبا جی (نمبردار جی)۔''

لاڈول نے پیار سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ایک بات میری سمجھ میں آ رہی ہے......''

''وہ کیا۔ہم بھی تو جانیں............''

''سوچو۔آفتاب کے اتنے بڑے بڑے گولے ٹھیک ہماری اُن پہاڑوں کے پیچھے آئے دن اُترتے رہتے ہیں۔ہے نا۔''

''ہاں ہے۔تو۔''

''مگر تم کہتے ہو۔وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا......''

''ہوتا ہے نا۔کیوں نہیں ہوتا۔ان پہاڑوں کے پیچھے کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں ہیں۔جن میں چراگاہیں،چھوٹی موٹی جھیلیں،ندیاں اور نالے ہیں............میں کئی بار اپنے ڈنگروں کو ہانکنے اور لانے وہاں گیا ہوں۔لیکن اُن جگہوں میں سورج کا کوئی گولہ پڑا ہوا کبھی نہیں دیکھا۔''

نمبردار کی بیوی سادگی سے سمجھاتی ہوئی بولی۔

''تو اُس کا مطلب یہ ہوا نا گوبا جی (نمبردار جی) کہ سورج کے گولے پہاڑ کے پیچھے اُتر کر پگھل جاتے ہوں گے۔اور پگھل پگھل کر جھیل میں سما جاتے ہوں گے......''

اپنی نادان بیوی کی اٹکل بازی سے نمبردار بے حد متاثر ہو کر کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا......اُسے اپنی بیوی کی سمجھ داری پر رشک آنے لگا تھا۔وہ فرط مسرت سے مسرور ہو کر بولا......''اس طرف تو میرا دھیان کبھی گیا ہی نہیں......واہ لاڈول۔تم کتنی سمجھ دار ہو۔مجھے تو ہر

کام کا مشورہ تم سے ہی لیتے رہنا چاہیے۔اور لوگوں کے تنازعوں کا فیصلہ کرنے سے پہلے بھی تم سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو جی۔" وہ خالص رومانی انداز میں شرما کر مسکرادی اور ڈوپٹے کے میلے پلو سے مُنہ چھپانے لگی۔

ابھی وہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ چھورول گھر سے نکل کر آنگن میں آگئی۔

نمبردار نے بیٹی کو دیکھا تو مسکرا کر کہا۔

"پُتر۔آج مجھے پتہ چلا کہ تمہاری اماں کتنی بُدھی مان ہے۔"

"ایسی کیا بات ہوئی ابالے (ابا جی) مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"اپنی اماں لے سے خود ہی پوچھ لو۔وہ بتائے گی۔"

چھورول اماں لے کی طرف پلٹی۔

"اچھا اماں لے (اماں جی) آپ ہی بتائے نا..........."

"بیٹی۔میں نے تمہارے ابالے سے پوچھا کہ ہر روز ایک نیا سورج اس طرف کی پہاڑوں سے اُبھر کر اُس طرف والے پہاڑوں میں اُتر جاتا ہے۔تو اتنے سارے سورج آتے کہاں سے ہیں اور جاتے کہاں ہونگے۔"

"اماں لے آپ کے ذہن میں یہ سوال پوچھنے کا خیال آیا کیوں۔"؟

"بیٹا۔پہاڑوں کے پیچھے اُترنے والے گولوں کا ڈھیر تو جمع ہوتا ہوگا نا۔"

ماں کی بے تکی بات پر چھورول کی ہنسی چھوٹی اور ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔پھر ذرا وقفے کے بعد ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اچھا تو ابالے نے کیا جواب دیا آپ کی بات کا۔؟"

"وہ تو کہتے ہیں۔کہ پہاڑوں کے پیچھے اور بھی پہاڑی گھاٹیاں ہیں......"

"یہ تو ابالے (ابا جی) نے ٹھیک کہا۔"

''اور کہتے ہیں کہ ان گھاٹیوں میں صرف جھیلیں، چراگاہیں اور ندی نالے ہیں۔''

''یہ بھی ٹھیک کہا ہے۔''

''وہ کہتے ہیں کہ وہاں سورج کے گولوں کا نام ونشان ہی نہیں۔''

''ہو بھی نہیں سکتا۔''

''یہی تو میں سمجھا رہی تھی انہیں۔ سارے گولے پگھل پگھل کر جھیلوں میں سما جاتے ہوں گے نا۔''

چھورول ماں کی سادگی پر ایک بار پھر کھل کھلا کر ہنس دی۔ اور ہنستی ہوئی بولی۔

''نا اماں لے...... ایسا نہیں ہے۔ سورج کے بہت سارے گولے نہیں۔ بس ایک گولہ ہے۔ جو ہمیشہ ایک ہی جگہ رہتا ہے۔ اور یہ جو مکان کھیت اور دریا والی ہماری زمین ہے نا۔ جس پر اونچے پہاڑ بھی ہیں۔ یہ دیکھنے میں تو ہموار لگتی ہے۔ مگر اصل میں یہ بھی سورج کے اُس گولے کی طرح گول ہے...... اور جو ہم سورج کو آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف روزانہ جاتے دیکھتے ہیں۔ یہ بھی دراصل ہماری نظروں کا دھوکا ہے...... حقیقت تو یہ ہے کہ سورج ایک جگہ رُکا ہوا ہے اور ہماری دھرتی ہمیں اُٹھائے دن رات اس کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ جس کا ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا...... اماں لے جس طرح ہم گاڑی میں سوار ہو کر کہیں جاتے ہیں...... یا جیسے ہوائی جہاز انسانوں کو لے کر ہوا میں چلتی ہے۔ ایسے ہی سمجھ لیجیے زمین بھی ایک گاڑی یا ہوائی جہاز کی طرح ہے۔ ہم اس پر سوار ہیں اور یہ ہمیں لئے سورج کے گرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اگر......'' ماں نے یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا۔............ ''اگر ایسا ہے تو رات کو سورج کیوں نظر نہیں آتی۔''

''اس لئے کہ رات کو چکر لگاتے لگاتے دھرتی خود گھوم کر پلٹ چکی ہوتی ہے۔''

نمبردار اور اُس کی بیوی بیٹی کی حاضر جوابی پر خوش تو ہوئے۔ مگر پلے کچھ نہ پڑا۔

چھورول کو بھی لگا کہ وہ اُنہیں مطمئن نہیں کر پائی ہے۔اسلیئے اُن سے اجازت لیتی ہوئی بولی۔

''اچھا ابا لے، اماں لے،۔آٹھ بجنے والے ہیں۔میں چلتی ہوں۔''

''جاؤ بیٹی۔''

نمبردار نے چھورول کو رخصت کرتے ہوئے تاکید کی۔

''ماسٹر جی کو ہمارا جولے کہہ دینا۔''

''جی ابا لے (ابا جی) کہہ دوں گی۔''

کہتے کہتے وہ صحن سے نکل گئی۔

رگزن کی بے ہودگی کا ذکر اُس نے گھر والوں سے نہ کیا تھا۔ورنہ شاید پڑھائی پر پھر سے پابندی لگ جاتی۔

دس منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا مشتر کہ ڈیرا آ گیا۔چھورول ''جولے'' کہہ کر کمرے میں چلی آئی۔

''آؤ۔آؤ............آ گئی۔''

''جی ماسٹر جی............آ گئی۔'' چھورول نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

''اِدھر کنارے بیٹھ جاؤ............''

''جی ماسٹر جی'' وہ ادب سے بیٹھ گئی

''چولھے پر دم کے لئے چاول چڑھا تھا۔

حسبِ معمول چھورول کے آتے ہی ماسٹر اکرم کچھ دیر بغلیں جھانکنے کے بعد ایک چھوٹی سی دری لے کر چھت پر بیٹھنے چلے گئے۔اسکول جانے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔میں نے بات کی شروعات کر دی۔

''اچھا تو یہ بتاؤ............کیا تم سچ مُچ میں پڑھنا چاہتی ہو۔''؟

''جی ہاں ماسٹر جی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''لیکن جب تک نہ تم پڑھنے کے طور طریقے جان لو۔تب تک اسکول میں داخلہ لینے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

''مگر ماسٹر جی۔اب تو میں نے بھرپور تیاری کر لی ہے۔پڑھنا لکھنا بھی آتا ہے۔اب اور کس چیز کی ضرورت ہوگی۔؟''

''مزید جس چیز کی ضرورت ہے۔وہ تم اپنے اندر پیدا کر سکتی ہو۔''

''ماسٹر جی۔کیا چیز نہیں ہے میرے اندر؟''

چھورول نے حیران ہو کر پوچھا تو میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''طالبانہ مزاج نہیں ہے تمہارے اندر...... یہ جو تم بات بات پر بے باک ہو جاتی ہو۔یا مچل مچل کر اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہو۔یہ تمہارے لئے کسی طرح سے ٹھیک نہیں۔اگر ایسا کرتی رہی تو سارے جوان لڑکوں کو تجھے چھیڑنے کا بہانہ ملتا رہے گا ....ایسا ہوا تو پھر سے چھوٹ جائے گی تمہاری پڑھائی۔اور میری ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔''

''ماسٹر جی۔کوئی مجھے تنگ کرے گا تو میں دانت نہ توڑ دوں گی اُس کی۔اور پھر مجھے کسی لڑکے سے کیا غرض......میں تو صرف آپ کے بارے میں سوچتی ہوں۔''

''ہاں ہاں۔سوچو میرے بارے میں ...... میں کب منع کرتا ہوں۔مگر جب جب سوچو اچھا ہی سوچ لیا کرو۔ایسا نہ سوچو کہ لوگ تم پر اور مجھ پر ہنسیں۔ہمارا مذاق اُڑائیں۔''

''ماسٹر جی ہنسنے والے پاگلوں کی طرح ہنستے رہیں تو ہم دونوں کی بلا سے۔''

''کسی کو خود پر ہنسنے دینا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی ....لوگ اُن پر ہنستے ہیں جن میں کوئی عیب ہوتا ہے۔تم اپنے اندر ایسا عیب کیوں پیدا ہونے دو گی جس پر لوگوں کو ہنسنے اور مذاق کرنے کا موقع ملے گا۔میں چاہتا ہوں کل کیا آج ہی تجھے داخلہ دلوا دوں......مگر۔؟''

''مگر کیا ماسٹر جی.............دیر کس بات کی ہے۔؟

''دیر کسی بات کی نہیں۔صرف ایک بات سمجھائے دیتا ہوں۔وہ یہ کہ اسکول میں میرا

مزاج آمرانہ یعنی کڑک رہتا ہے...... ڈسپلن شکنی مجھے قطعی پسند نہیں۔ خاصکر بے ہودہ باتوں کے میں سخت خلاف ہوں۔"

"ماسٹر جی۔ اسکول میں تو آپ کو شکایت کا موقع کبھی نہیں دوں گی۔ خوب دل لگا کر پڑھوں گی............ لیکن......" اُس نے شرما کے نگاہیں جُھکا دی۔ اور مزاج میں ایک بار پھر شوخی پیدا کرتی ہوئی شرارت آمیز لہجے میں بولی۔"

.... "لیکن کشمیر تو میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔"

"ہاں ہاں............ کیوں نہیں............ چلے چلنا۔"

میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں وہاں تجھے اپنوں سے ملوا دوں گا۔ اپنے بزرگوں سے ملواؤں گا۔ میرے پاس ان میں سے چند ایک کی تصویریں ہیں۔ تم دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتی ہو۔"

"ہاں ہاں ضرور ماسٹر جی............ مجھے اُن کی ایک جھلک دکھلا دیجئے نا۔"

اس کے اصرار کرنے پر میں نے ٹرنک کا تالا کھول کر فوٹو فریم نکال لیا۔ اور اُس کی طرف جان بوجھ کر بڑھاتا ہوا بولا۔

"دیکھ لو...... یہ سبھی میرے اپنے ہیں جو کشمیر میں میرے لوٹنے کا منتظر ہوں گے۔"

چھورول نے متجسس نگاہوں سے پہلے میری طرف دیکھا۔ پھر جھپٹ کر فریم لے لی۔ اور خوش ہو کر پوچھ بیٹھی۔

"کون کون ہیں یہ لوگ"۔؟

"میرے اپنے ہیں بالکل سگے............ یہ میری اُمی ہے۔ میں نے شہادت کی انگلی سے تصویر پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ان کے ساتھ میرے ڈیڈی ہیں۔"

"ان کے آگے کھڑے یہ چھوٹے چھوٹے بچے کون ہیں۔؟"

"یہ میرے جگر کے دو ٹکڑے ہیں۔ میرے بچے میرے نُورِ نظر۔"

میں نے دونوں معصوموں پر پیار جتاتے ہوئے جواب دیا۔

بچوں کے بارے میں سُن کر چھورول ہکا بکا ہوگئی۔ اُس کے ذہن میں گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔ ہاتھ پیر گویا سُن ہوگئے۔ بے قراری بڑھ گئی۔ میں نے اِس کی حالت نظر انداز کر کے کہا۔

''اور یہ امیّ جان کے پیچھے میں کھڑا ہوں۔''

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گویا بڑی دور سے بولی۔

''اور یہ آپ کے ساتھ کون کھڑی ہے ماسٹر جی۔''

میں نے فخر جتاتے ہوئے کہا۔

''یہ میری چہیتی بیوی ہے۔ شائستہ اختر۔''

بیوی کے بارے میں سُنتے ہی چھورول پر گویا پہاڑ گر پڑا...... میں چاہتا تھا کہ اُس کے دل ودماغ پر ان تصویروں کا ایسا اچھا اثر پڑے کہ خواب وخیالوں کی دُنیا سے واپس آکر صحیح طریقے سے جینا سیکھ لے اور پڑھائی کی ایک اچھی شروعات کے ساتھ آگے بڑھتی جائے۔

اُس نے غصّے سے تصویر کو ایک طرف پٹخ دیا۔ اور کچھ سوچ کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چُھپا لیا۔

اُس کی حرکت پر میں خاموش رہا۔ جنون کے مارے وہ سسکنے لگی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر اپنے حال پر چھوڑے رکھا۔ پھر ذرا ہمت کر کے اُس کے ہاتھوں کو چہرے سے ہٹا کر دیکھا۔ آنسوں کی جھڑی سے رخسار بھیگ چکے تھے۔ وہ زار زار آنسوں بہا رہی تھی۔

''اے چھورول کیا ہوا تجھے۔ روتی کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ تو۔ کیا بات ہے۔ تم روتی رہو گی تو اکرم کیا سمجھے گا۔ دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔''

''مجھے کسی کی پرواہ نہیں......'' اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے ٹوک دیا۔

''ایسا نہ کہو۔ اب کچھ اچھا کر دکھانے کی سوچو۔''

چھورول نے خاموشی سے آنسو پونچھ لئے............ پھر میری طرف شرارت بھری

نظروں سے دیکھنے لگی۔ بولی۔

"میں پیچھا نہیں چھوڑوں گی.................. آتی رہوں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ بڑا بھائی سمجھ کر آتی رہنا............"

"خوب ستاتی رہوں گی۔ بھلے ہی داخلہ نہ دلوانا۔"

"داخلہ تو میں آج ہی دلوادوں گا۔"

"ہمارے مذہب میں بھائی ایسے ہی نہیں بنائے جاتے۔"

"تو پھر کیسے بنتے ہیں............"

"کئی دنوں کی منتر جاپ کے بعد دیوتا خود بنا لیتے ہیں۔"

"تو تم جاپ کر لینا۔"

"مجھے بھائی کی کوئی ضرورت نہیں ......" اُس نے بے رُخی سے کہہ دیا۔ اور سر جھکا کر خاموشی سے بچھی ہوئی چٹائی کے ریشوں کو چھیڑنے لگی۔"

چاول پک کر تیار ہو چکا تھی۔

دس بجنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔

میں نے برتنوں کو سلیقے سے رکھتے ہوئے کہا۔

"کشمیر تو میں تجھے ضرور گھما لاؤں گا۔ بس تم خوب پڑھ لکھ کر کچھ اچھا کر دکھانا......"

اکرم چھت سے اُتر آیا تو چھورول سنبھل کر بیٹھ گئی۔

دونوں تیار ہو کر ڈیوٹی کے لئے چل پڑے۔

چھورول بھی سر جھکائے ان کے ساتھ ہولی۔

آج وہ ایک کٹی پتنگ کی طرح اپنا توازن کھو کر ڈول رہی تھی۔ اُس کا چہرہ نہ صرف اُترا تھا بلکہ چنچل پن میں بھی فرق آ گیا تھا۔ وہ رتھ پر پڑے بے زبان مورتی کی طرح کھنچتی چلی گئی۔

باب چودہواں

صبح سے ہی گہما گہمی تھی۔ جیسے کہیں کوئی میلہ لگا ہو۔

کئی بچے خوش پوش ہو کر بے چینی کے عالم میں اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ چل پڑے۔ اور کئی فکر مند چہرہ بنائے نفس و نفیس چوغے زیب تن کئے جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ہر پریوار کا کم سے کم ایک فرد بچوں کے ہمراہ چلنے کو تیار تھا۔ کافی دنوں کے انتظار کے بعد بچوں کا کچا چٹھا معلوم ہونے کا وقت آ چکا تھا۔

گاؤں میں صبح سے ہی بھاگ دوڑ سے ہلچل سی مچی رہی۔

کوئی منّت مانگنے گپہ کی طرف دوڑا۔ کوئی گپہے سے لوٹ آیا۔ کہیں چھور تنوں کے طواف ہوئے۔ کہیں پرارتھنا سپھل ہونے کے منکے جپے۔ ہر سو خوشخبری کی آرزو میں آشیرواد اور دعائے خیر دی جانے لگی۔

آج ان میں سے کتنے بچے منہ لٹکائے لوٹیں گے اور کتنے خوشی سے اُچھلتے اس بارے میں رائے دینا قبل از وقت ہوتا۔

چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیاں اپنے برابر کے ساتھیوں اور سہلیوں کو ساتھ چلنے کے لئے گھروں سے بُلا رہے تھے...... جوں جوں وقت قریب آتا گیا۔ گلی، کوچے، کھیت، پگڈنڈی، نشیب و فراز غرض گاؤں کے ہر حصّے سے بچے اور اُن کے رفقاء اُمنڈ نے لگے۔

چھورول کو لینے ڈولکر اُس کے گھر ہی چلی آئی...... اور آتے ہی صحن سے آواز دی۔

"چھورول جی۔ چھورول جی..........."

"ہاں جی۔ ہاں جی۔" چھورول نے فوراً اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔"

"چلنا نہیں ہے کیا..........؟"

"ہاں ہاں چلنا ہے جی.............. بس ایک پل میں آتی ہوں۔"

چھورول کی ماں نے روشندان میں سے جھانک کر ڈولکر کا استقبال کیا۔ پھر مسکرا کر کہا۔

"آج اچھی سی خوشخبری لے کر آنا بیٹی۔"

"جی آنٹی جی۔ آپ پرارتھنا کریں ہمارے لئے۔"

"بھگوان سب کو کامیاب کرے..........."

اُس نے کامیابی کی دُعا کے بعد کہا۔

"......لیکن بیٹی اب جو امتحان میں لکھا ہوگا پھل تو اُسی کا ملے گا نا۔"

"جی آنٹی جی۔ ہم نے ٹھیک ٹھاک ہی لکھا ہے۔ باقی بھگوان جانے..........."

"بھگوان کامیاب کرے۔" ماں نے ایک بار پھر دُعا دی۔ "دیوتا سبھوں سے راضی ہوں۔" چھورول کمرے سے نکل آئی۔ اور آتے آتے بولی۔

"ابھی تو وقت ہے ڈولکر"

"ہاں چھورول۔ رزلٹ کا دھڑکا بھی تو ہے.......... گھر میں بالکل من نہیں لگا۔ سوچا دھیرے دھیرے چلتے جائیں تو پہنچنے تک دل بہلا رہے گا۔"

"ٹھیک سوچا تم نے...... آؤ چلتے ہیں۔ اچھا ماں لے (جی) ہم چلتے ہیں۔"

"جاؤ بچو۔" چھورول کی اماں نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ "بھگوان تمہیں خوشی دے۔"

دونوں سہلیاں کامیابی کی کامنا لے کر نکل پڑیں۔

راستے میں جو بھی چھورتن اور مانے ملے۔ دونوں نے پاس ہونے کی آرزو میں ان کا طواف کر ڈالا۔

"اے ڈولکر..........." چھورول نے چھورتنوں کا طواف کرتے ہوئے دل کی حالت ظاہر کی......"جی بہت گھبراتا ہے۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔ بھگوان کرے خیر ہو۔ ورنہ بہت شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔"

ڈولکر کے خاموش ہوتے ہی چھورول دوبارہ بولی۔

"تُو تو ضرور پاس ہوگی ڈولکر۔ تو نے پڑھائی کبھی چھوڑی ہی نہیں نا اس لئے...... مجھے دوبارہ داخلہ لئے ہوئے ابھی صرف پانچ ہی مہینے ہوئے ہیں۔ اِس چھوٹی سی مدت میں کتنا پڑھ پائی ہوں گی۔ تم اندازہ کر سکتی ہو۔"

"اندازہ کرنے کی بات نہیں رہی۔ تم نے کم مُدّت کے باوجود جتنی جی جان سے محنت کی ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ تم نے تو وسیم سر کی مدد سے پورے سال کا نصاب مکمل کر ڈالا تھا۔ بلکہ تم تو ہم سے زیادہ پڑھ چکی تھی۔"

"سو تو ہے ڈولکر۔ پھر بھی دل میں ایک ڈر سا بیٹھا ہے۔ جو بے چین کئے دیتا ہے۔ جب تک رزلٹ سُن نہیں لیتی۔ یہ ڈر دل اور دماغ پر چھایا ہی رہیگا۔"

"پریشان نہ ہو...... میرا دل گواہی دیتا ہے۔ تم ضرور پاس ہو جاؤ گی۔ میرے حساب سے تمہاری کامیابی سو فیصد یقینی ہے۔"

دونوں سہلیاں چھورتنوں کا طواف کرتی ایک دوسرے کو دلاسہ دیتی بڑھتی گئیں۔ رستے میں اور دو لڑکیاں آملیں۔ دونوں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"جو لے چھورول۔ جو لے ڈولکر..........."

اِن دونوں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''جولے انگمو۔ جولے ڈولما۔''

علیک سلیک کے بعد چاروں سہیلیاں ساتھ چل پڑیں۔

ڈولکر نے چلتے چلتے سبھوں پر اُچٹتی سی نظر ڈالی پھر سبھوں کے فکر مند چہروں کو دیکھ کر گہری سانس لیتی ہوئی بولی۔

''بھگوان کرے ہم چاروں خوشخبری لے کر لوٹیں۔''

انگمو نے پہاڑی پر بنے بُدھ وہار کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے سویرے گنپہ جا کر بھگوان کے چرنوں میں سر رکھ کر اپنے اور تم سبھوں کے لئے خوب پراتھنا کی۔ اور نیت کر لی۔ کہ اگر ہم پاس ہو گئے تو بھگوان کے چراغ میں تیل چڑھاؤں گی۔''

''شکریہ انگمو ....''

ڈولکر متاثر ہو کر بولی۔

''تم نے نیک نیتی سے سب کے لئے پراتھنا کی ہے تو نا اُمیدی کبھی نہیں ہوگی۔''

''پراتھنا میں نے بھی کی۔'' ڈولما کے ہونٹ ہلے۔ ''اوروں نے بھی کی ہوگی۔ کسی نے پرشاد چڑھانے کی نیت باندھی ہوگی۔ کسی نے چرنوں میں کھاتکس ارپن کرنے کے ارادے کئے ہوں گے۔ کسی نے روپے بھینٹ کرنے کا من بنایا ہوگا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ یکسان قابلیت اور یکسان محنت نہ ہو کر بھی سب کے سب بچے پاس ہو جائیں۔''

''یہ تو بھگوان ہی جانیں......'' انگمو نے عقیدت مندانہ جذبہ کے تحت جواب دیا۔ ''اس بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے، محنت کرنے والے بھی بھگوان سے آس لگائے رہتے ہیں۔ اور کام چور بھی۔''

گاؤں کے نشیب وفراز کی چھوٹی چھوٹی بستیوں سے کئی رستے اور پگڈنڈیاں اسکول تک جاتی تھیں...... جس پگڈنڈی سے اُن کا گذر تھا۔ آگے جا کر اُس میں سے کئی رستے نکلتے تھے......

ایک رستہ ندی کنارے کنارے کھیتوں اور پیڑوں کے درمیان سے ہو کر اسکول اور اطراف کو چلا گیا تھا...... دوسرا گنپہ کی پہاڑی دامن سے سیدھا اسکول تک جا پہنچا تھا۔ اور تیسرا بٹیا کی صورت میں سنگریز سطح پر اوپر ہی اوپر نصف پہاڑی تک جا کر قطار میں بنے چھورتنوں اور لمبے لمبے مانے کے پیچھے سے گھوم کر نچلے رستے سے دوبارہ ملا تھا۔ ان چھورتنوں اور مانے سے بہت اوپر قدیم بودھی خانقاہ (گنپہ) تھی۔ جس کی چھتوں کے کنارے کئی اونچے اونچے کھمبے نصب تھے۔ ان کھمبوں کے اوپری حصوں پر ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک منتر لکھے ہوئے سوتی پھریرے ہواؤں کے دوش پر مسلسل پھڑ پھڑا رہے تھے۔ جو بودھ عقیدے کی رُو سے گاؤں کے امن وامان، سُکھ شانتی اور خیر و برکت کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

آج تمام پگڈنڈیوں پر اسکول کی طرف جانے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ورنہ باقی دنوں میں پہاڑی دامن والا رستہ اور دوسرے کئی پگڈنڈیاں سنسان ہی پڑی رہتی تھیں۔

چاروں لڑکیاں کھیتوں کھیت جانے کے بجائے پہاڑی دامن کے پگڈنڈی پر مڑ گئیں۔ کچھ آگے جا کر پگڈنڈی میں سے ایک بٹیا اوپر بنے چھورتنوں کی طرف اُٹھ گئی۔ چاروں سہیلیوں نے ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے یوں دیکھا۔ گویا جاننا چاہتی ہوں کہ بالائی چھورتنوں کی طرف جائیں نہ جائیں......کوئی کچھ نہ بولی تو چھورول خاموشی سے اوپری بٹیا پر چل پڑی۔ بٹیا پر سنگریزے اس قدر بکھرے پڑے تھے کہ چڑھائی چڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔

کسی طرح اوپر پہنچے تو من کی شانتی اور پاس ہونے کی آرزو میں پرارتھنا کرتی ہوئی ساری لڑکیوں نے چھورتنوں کا طواف کیا۔ طواف کے بعد سبھی دوسری طرف سے سنبھل سنبھل کر نیچے اُتر آئیں۔

چھورول خاموشی سے چلتی رہی۔ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد سے ہی اُس کے مزاج میں ناقابل یقین بدلاؤ آ چکا تھا۔ اب نہ وہ کُھل کر بولتی تھی۔ نہ بات بے بات پہلے کی طرح

کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ نہ بے مقصد گھومتی۔ نہ شریر بچوں کے منہ لگتی تھی...... کسی کے ستانے پر معاملے کو اُلجھانے کے بجائے خوبصورتی سے ٹال جایا کرتی تھی۔

کبھی کبھار موقع محل دیکھ کر رگزن پریشان کرنے پر تُل جاتا تو اُسے میرا ڈر دکھا کر پچھاڑ دیتی۔ میرے ڈر کی وجہ سے رگزن کو اُسے ستانے کا موقع کم ہی ملتا۔ اس طرح چھورول کو سنجیدہ رہنے کا بھرپور موقع ملتا رہا۔

اس سنجیدگی کی وجہ یا نسکت سے چُھوٹا ہوا ناطہ بھی تھا اور میری دی ہوئی نصیحت بھی۔ اس کے علاوہ خود اُس کے اپنے خدوخال کا نکھار بھی جو دن بہ دن پروان چڑھ کر کلی سے حسین پھول بنائے جا رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ وہ کسی نہ کسی بات سے مجھے متاثر کر کے اچھی شاگرد اور بہتر دوست ہونے کا ثبوت دینے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔ اُس کے اندر سچ مُچ کا ٹھہراؤ، اندازِ تکلم میں بدلاؤ اور نوک جھونک میں صبر و تحمل دیکھ کر ہر بار میں حیران ہوتا رہا۔ شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ چھورول نے ایک اچھے انسان کا ثبوت دینے کے لئے میرا اور اکرم کا بھرپور خیال رکھا۔ سبزیوں اور انڈوں کی کمی نہ ہونے دی۔ موسمی پھل جیسے سیب اور گیلی خوبانیوں کے ڈھیر مہیا رکھے۔ ڈیرے کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہی۔

اُس کی ساری حرکتیں میرے دل و دماغ پر رومانس کا اثر پیدا کرنے کی ایک سوچی سمجھی کوشش تھی...... میری جگہ کوئی اور ہوتا تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھٹک چکا ہوتا۔

مگر میں نے کبھی کوئی غلط اشارہ پیدا ہونے کا موقع نہ دیا۔ لیکن ڈر تھا کہ اگر یہ سلسلہ ایسا ہی چلتا رہا تو ایک دن ضرور پھسل جاؤں گا۔ آخر بشر جو ٹھہرا۔

کچھ بھی ہو، میں اور اکرم اُس کے کام سے اتنے متاثر تھے۔ کہ ہر اچھے معاملے میں حوصلہ افزائی اور رہبری کرتے رہے۔ نیتجتاً وہ خوب پڑھی۔

چھورول تینوں لڑکیوں کے درمیان گُم سُم چلتی گئی۔

اسکول کے قریب پہنچتے پہنچتے دائیں بائیں سے آنے والوں کی ٹولیاں بنتی گئیں۔ بہت سارے بچے اپنے اپنے رفقاء کے ہمراہ اسکول کے صحن میں بے قراری سے ٹہلتے نظر آئے۔ بھیڑ کافی بڑھ چکی تھی۔ آفس میں رزلٹ بھی تیار تھا۔

لوگ بے قراری سے گیارہ بجنے کا منتظر تھے رزلٹ سُنانے کے لئے یہی وقت مقرر کیا جا چکا تھا۔

گیارہ بجتے بجتے سارے طلباء اور لوگ صحن میں قاعدے سے بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے اسٹاف کے ہمراہ رزلٹ شیٹ لئے برآمدے پر نمودار ہوا......انہیں دیکھ کر سبھوں کے دل کی دھڑکیں تیز ہوگئیں۔ کیوں نہ ہوتیں۔ پورے ایک سال کا معاملہ جو تھا۔

اب اکرم صاحب رزلٹ سُنانے لگے۔ رزلٹ سُنانے کی رفتار کے ساتھ ہی مجمع میں بے چینی سے ہلچل بڑھ گئی۔

کچھ بچوں نے شرما کے منہ چُھپا لیا۔

کچھ آہیں بھرنے لگے۔

اور کچھ خوشی سے مچل مچل اُٹھے۔

شاد و ناشاد کا ملا جُلا ماحول بنا۔

کسی کو تسلی دی جانے لگی اور کوئی مبارکبادی کے الفاظوں سے سرشار ہوا۔

چھورول کی محنت بھی رنگ لے آئی۔ مِڈ سیشن (MID.SESSION) میں داخلہ ہو چکنے کے باوجود وہ بہت ہی کم مدت میں نویں جماعت کا امتحان پاس کر گئی۔

گویا میرے اور اکرم کی کوششوں سے اُلجھی ہوئی کشتی کو رستہ مل گیا۔ ٹمٹماتے دئے میں جان پڑ گئی۔ چھورول میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بڑھ گیا............اس سے زیادہ ہمیں کیا چاہئے تھا۔

ڈولما، انگمو اور ڈولکر اپنا اپنا رزلٹ سُن کر جھوم اُٹھیں۔ یکے بعد دیگرے خوشی سے چلائیں۔

''میں پاس ہوگئی۔''

''میں بھی پاس ہوگئی۔''

"ہم چاروں پاس ہو گئے۔"

تینوں نے اُدھم سا مچادیا۔

چھورول اپنا رزلٹ جاننے کے بعد فرط جذبات میں ہاتھ جوڑے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ گویا کہہ رہی ہو۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُس کی آنکھوں میں شکرانے کے آنسو بھر آئے۔ منہ روہانسا ہو گیا۔

میں نے مسکرا کر سواگت کیا اور ہاتھوں کے اشارے سے آشیرواد دے ڈالی۔

رگزن مجمع میں دوسری طرف کھڑا تھا۔

وہ ہم دونوں کو مشکوک نگاہوں سے گھورے جارہا تھا۔

باب پندرواں

دن گذرتے گئے......رگزن کی شرارتیں کبھی کم اور کبھی تیز ہوتی رہیں......میں بھی مسلسل دباؤ بنائے رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اکثر اساتذہ نئی جوانی میں تازہ قدم رکھنے والے طلباء و طالبات کے ساتھ یہ سوچ کر دوستانہ تال میل روا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شرمائے اور جھجکے بغیر اپنی نصابی مشکلات اُن کے سامنے رکھ کر استفادہ حاصل کرسکیں۔لیکن کچھ بد مغز اس رشتے کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے بجائے اُستاد کی کمزوری سمجھ کر سر پر ہی سوار ہوجاتے ہیں اور غنڈہ گردی اور دادا گری کو نصب العین بنا کر قدم قدم رسوائیوں اور ناکامیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے اُبھرتے اپنی ساری زندگی بتا دیتے ہیں۔شاید رگزن اور اُس کے ساتھیوں کا بھی ایسا ہی حال ہونے والا تھا۔اور میں نہ چاہتا تھا کہ میرے کسی بھی شاگرد کی زندگی کسی وجہ سے خراب ہو......

اِن کی کرتوتوں سے اُن کے والدین بھی تنگ آچکے تھے۔

کہیں کسی کی چوپائے کو پہاڑی کے پچھواڑے نالے کی طرف ہانک دینا......کہیں کسی بکری کے تھن کا دودھ چٹ کر جانا اور کہیں خوبانیوں سے لدے پھندے پیڑ کا ستیاناس کر ڈالنا

اِن کی شرارت میں شامل تھا۔

ان کے والدین کے کان لوگوں کی شکایتیں سُن سُن کر پک چکے تھے...... کبھی کبھی تو وہ اُستاد سے بھی طوفانِ بدتمیزی سے پیش آنے میں نہیں ہچکچاتے لیکن اُستاد اتنی بڑی بات اُن کی نا سمجھی سمجھ کر معاف کرنے کے بہانے نظر انداز کر دیتا۔ دسویں جماعت میں آتے ہی ان کی ہمت اتنی بڑھی کہ نت نئی شرارتوں میں تیزی آ گئی۔

ایک دن تو حد ہی کر دی...... جب چھورول آنکھوں میں بے اختیار آنسو لئے شکایت کرنے نور بُو صاحب کے دفتر میں بھاگی چلی آئی۔

ہم سب اسے دیکھ کر چونک پڑے۔ اس لئے کہ آج تک کوئی طالبہ اس طرح شکایت کرنے نہ آئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر نور بُو صاحب بھی حیران ہو کر اُسے تکنے لگے۔ پھر ذرا سی توقف کے بعد شفقت سے بولے۔

''کیا بات ہے بیٹی...... کیا ہوا...... بولو چھورول بیٹی............ کسی نے ستایا کیا؟''

وہ ہکلانے لگی۔

''سر وہ رگزن...... سر میں اسٹول پر بیٹھی تھی............ سر وہ رگزن نے...... سر اُس نے مجھے۔''

''ہاں ہاں............ ڈرو نہیں............ کُھل کر بتاؤ...... کیا ہوا؟''

''سر میں اسٹول پر بیٹھی تھی ...... اُس نے میری اسٹول کھسکا دی۔ اور مجھے ....'' چھورول شرما کر خاموش ہو گئی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہم سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''دسویں جماعت میں کس کا پیریڈ ہے................؟''

''میرا ہے جناب۔'' پنڈت دینا ناتھ جسے ہیڈ ماسٹر صاحب کسی رجسٹر پر دستخط کرنے کے لئے پل بھر پہلے چپراسی کی مدد سے بلوا لائے تھے۔ فوراً بولا۔ ''آپ کے بُلانے پر ہی آیا ہوں۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' پھر اُس لڑکی سے مخاطب ہو کر دوبارہ پوچھا۔

''بتاؤ بیٹی کیا شرارت کی اُس کم بخت نے...........؟''

''جی......مم......میں کیا بتاؤں...........'' کہہ کر وہ شرم سے سُرخ انگارہ ہوگئی۔

چھوروں کی ہچکچاہٹ پر دفتر میں بیٹھے سبھی اُستاد ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔لڑکیوں سے بات بے بات لڑنا جھگڑنا تو بار ہا سُننے میں آیا تھا۔لیکن چھیڑ چھاڑ یا بے حیائی کی شکایت آج پہلی بار سامنے آئی تھی۔ مجھے لگا کہ اب کی بار اعتدال پسند اساتذہ بھی تاؤ کھانے لگے ہیں......شاید انہیں بھی رگزن سے نفرت ہو چلی تھی۔

''اس رگزن کے بچّے کا کوئی علاج کرو یار..........'' ہیڈ ماسٹر نور بُو صاحب نے پریشان ہو کر کہہ دیا۔''اسے کوئی سبق تو سکھاؤ..........کچھ ایسی سزا تجویز کرو کہ آئندہ اوچھی حرکتوں سے باز رہے..........آج اس کی یہ حرکت نظر انداز کر دی گئی تو کل سے ایسا تماشہ ہمیشہ کے لئے رائج ہو کر رہ جائے گا۔کسی کی عزت، عصمت باقی نہ رہے گی..........کوئی تو کچھ کرو..........'' وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر رہ گیا۔

دفتر میں براجمان سارے اساتذہ اب کی بار تادیبی کاروائی کے حق میں تھے۔اس کے لئے انہوں نے میرا انتخاب کرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کو رائے دینے کی کوشش کی۔ پنڈت جی رائے دیتے ہوئے بولے۔

''ہم سبھی جانتے ہیں کہ آج تک بہت سارے بچوں کو وسیم صاحب ہی راہِ راست پر لاتے رہے ہیں..........ان کے اندر ہمارے مقابلے میں ہمت حوصلہ زیادہ موجود ہے۔ سب سے بڑی بات یہ جوانمرد ہیں..........ہم سب عمر رسیدہ تھکے ماندے کمزور لوگ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتے..........اگر آپ رگزن اور اِس جیسے دوسرے شریر بچوں کو سُدھارنے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال دیں تو زیادہ موزوں رہے گا......البتہ ہم وسیم صاحب کو ہر قسم کا تعاون دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔''

پنڈت جی کی بات ختم ہوئی تو نور بُو صاحب میری جانب متانت اور سنجیدگی سے دیکھنے

لگے۔ پھر کچھ لمحے بعد بولے۔

"میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں ......اس کام کے لئے آپ سے موزوں کوئی نہیں ہوسکتا......میری گذارش ہے۔ اِس بات کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے کر اسکول کا ربط وضبط اور اسکول کی لاج بچائے رکھنے میں ہماری مدد کریں۔ اِن نا سمجھ بچوں کے عقل پر پڑا ہوا پردہ چیر ڈالیں تاکہ اسکول کا مستقبل بدنامی کی تابنا کیوں سے بچ سکے۔

اکرم اپنی کرسی پر بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ مجھے لگا وہ بھی یہی چاہتا ہے۔ میں نے اقرار میں سر کو جنبش دی۔

چھورول کی آنکھوں سے اب بھی آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔

کچھ دیر بعد چپراسی نے گھنٹی بجا کر نئے پیرڈ کی اطلاع دے ڈالی۔ مجھے دسویں جماعت میں جانے کے لئے اُٹھنا پڑا۔ جاتے جاتے ماسٹر دور جے نے ایک پتلی سی چھڑی پکڑوا دی۔

"آؤ میرے ساتھ..........."

میرے حکم پر وہ سر جھکائے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ جماعت میں داخل ہوتے ہی بچوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سبھی تعظیم میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے ہی پل اشارہ پا کر دوبارہ بیٹھ گئے۔ چھورول سفید جارجٹ کے پلو سے آنسوؤں پونچھتی ہوئی اپنے اسٹول پر جا بیٹھی۔

مارے غصے کے میرا تن بدن سلگ رہا تھا۔ لیکن حقیقت جانے بناء کسی کارروائی کی ابتداء کرنا سراسر زیادتی ہوتی...........لہذا آپے میں رہتے ہوئے چھڑی کی نوک سے رگزن کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔

"یُو......you stand up تم کھڑے ہو جاؤ۔"

اتنا تو تھا ہی کہ طالب علموں میں حکم عدولی کی جُرات شروع سے ہی نہ تھی پھر بھلے ہی پیٹھ پیچھے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوں۔ رگزن خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ماتھے یا رُخسار پر پچھتاوے کا کوئی اثر نہ تھا۔

میں اُس سے معمول کی طرح مخاطب ہوا۔

''کیوں بھئی رگزن ...... یہ کیا ماجرا ہے......؟ اِسے کیوں رُلا دیا؟

رگزن کے ہونٹوں پر شرارت بھری مُسکان اُبھری۔ لیکن خاموشی بدستور چھائی رہی۔

''بھئی میں پوچھتا ہوں۔ چھورول کے ساتھ ایسی کیا حرکت کی تم نے جو وہ اب تک رو رہی ہے..........''

وہ کچھ نہ بولا۔ بس ایک بُت کی طرح خاموش کھڑا رہا۔

میں نے ساری کلاس پر سرسری نگاہ دوڑائی۔ پھر اُس کے قریبی ساتھی کی جانب اشارہ کیا۔

''نمگیل .... کھڑے ہو کر بتاؤ تمہارے دوست نے کیا شرارت کی۔''

رگزن کا دوست بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور گویا بڑی دور سے دبی آواز میں جواب دیا۔

''سر۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔''

''تو کیا تم کلاس میں آنکھیں موندے سوئے رہتے ہو۔''

میری طنز پر سارے بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ نمگیل جھینپ کر بغلیں جھانکنے لگا۔

''بیٹھ جاؤ۔ Sit Down''

وہ بیٹھ گیا تو میں نے پورے کلاس پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا............؟''

سبھوں نے ایک نظر رگزن پر ڈالی۔ لیکن اسے کنکھیوں سے گھورتا پا کر یکے بعد دیگرے نظریں جھکا دیں۔ ظاہر ہے سبھی اُس سے ڈرتے تھے۔

''ہوں۔'' میں حالات کی نزاکت بھانپتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات ہے۔ تو تم سب اس سے ڈرتے ہو..........؟

میری طنز کا کسی نے جواب نہ دیا۔ سبھی نگاہیں جُھکائے خاموش رہے۔ البتہ اگلی قطار میں ایک لڑکے نے کانا پھوسی کے انداز میں دوسرے ساتھی سے کہا۔

''اے مورپ میں بتادوں کیا.........ابھی ساری ہیکڑی نکل آئے گی سالے کی۔''

''ارے نہیں نہیں ....'' مورپ نے اُسے ٹوک کر روک دیا۔ ''تمہاری شامت آئی ہے کیا جو اس کے خلاف بول کر ہمیشہ کے لئے پنگا مول لو گے......اپنا منہ بند رکھو اِسی میں بھلائی ہے۔''

میرے سِوا ان دو لڑکوں کی باتیں شاید ہی کسی نے سُنی ہو۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر اَن سُنی کر دی۔ میں ان کے راز کی باتیں فاش کر کے انہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

پوری جماعت میری جانب متوجہ تھی۔ میں بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سب رگزن کو اچھا انسان بنانا نہیں چاہتے ہو۔ یعنی اگر یہ بڑا ہو کر......عزت دار شہری بننے کے بجائے......غنڈہ چور یا قاتل بن کر بدنامیوں اور مصیبتوں کے بھنور میں پھنستا چلا جائے تو تمہیں قطعی افسوس نہ ہوگا......ہاں بھئی افسوس کیوں ہو......یہ تمہارا، تم سبھوں کا دشمن جو ٹھہرا......بات بے بات تم لوگوں سے بھڑتا رہتا جو ہے......اسے پولیس مختلف الزاموں میں پکڑ جکڑ کر حوالاتوں اور کچہریوں کے چکر میں در بدر رکھے۔ تو فائدہ تو تمہارا ہی ہوگا نا......سچ ہے تمہاری تو آنکھ کا کانٹا نکل جائے گا۔''

سارے طلباء میری باتیں حیرت سے سُنتے رہے۔ رگزن بھی حیران ہو کر میری طرف متوجہ تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ میں کیا پہیلیاں بُجھا رہا ہوں۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُن سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

''بڑے خود غرض ہو تم سب......پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک اکٹھے پڑھتے کھیلتے آئے ہو......کیا تم سب میں کوئی بتا سکتا ہے کہ جب [illegible] معصوم سے بچے تھے۔ تو تمہیں والدین نے اسکول میں کیا سوچ کر داخلہ دلوایا ہوگا؟''

''ہاں سر۔ معلوم ہے۔'' مورپ کے دوست نے فٹاک سے جواب دیا تو میں نے روک کر کہا۔

''معلوم تو تمہیں اب ہے۔ کیونکہ اب تم چھوٹے بچے نہیں رہے۔ بڑے ہو گئے ہو......

ساری کلاس میری جانب ہمہ تن گوش تھی۔ میں کہے جا رہا تھا۔

"......کیا خود کو نیک اور اسے بد یا بدکردار بنتے دیکھنا تمہیں راس آئے گا......؟ یاد رکھو۔ خود کو ڈاکٹر، انجینئر اور اپنے دوست کو مریض لا دوا، سڑک چھاپ، آوارہ، چور، جنگجو، قاتل بننے تک کی مہلت دینا تمہارے ضمیر کی ہار ہوگی......اگر ایسا ہے تو تم سبھوں کے لئے شرم کی بات ہے......تمہاری دوستی، دوستی نہیں ایک ڈھکوسلا ہے......دوستی کے نام پر دھبہ ہے......اگر ایسا ہے تو تم سب خود غرض ہو۔ مطلبی ہو......لیکن یاد رکھو یہی دوست جب کل تمہارے معاشرے میں بدمعاش اور قاتل کے نام سے پکڑا جائے گا۔ آوارہ گردی اور شرپسندی کے نام پر سلاخوں کے پیچھے دھکیلا جائے گا۔ تب تمہارے گاؤں کی کتنی رسوائی ہوگی......تب تمہارا زندہ ضمیر اپنے دوست کی حالت زار پر تمہاری ملامت ضرور کرے گا......تمہارے سینے پر پچھتاوے کے آرے چلیں گے لیکن تم تڑپ کر افسوس کرنے کے سوا کچھ نہ کر پاؤ گے......اس لئے رگزن کے ہم جماعتو۔ اب بھی وقت ہے۔ خدارا رگزن کے ماضی کو تاریکیوں اور تباہیوں سے بچاؤ......اسے سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرو۔ دوستی کے ناطے سمجھاؤ۔ نہ سمجھے تو سمجھانے کا کوئی راستہ بناؤ......ڈر کے مارے اِس کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے مزید نہ بگاڑو......میں اسے سدھارنا چاہتا ہوں۔ اسے سدھارنے میں میری مدد کرو......کوئی تو بتا دو اس نے چھورول کو کیوں رُلا دیا ہے۔"

سبھی خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ اُنہیں خاموش پا کر میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"مندر، مسجد، گونپہ اور گرجا کی طرح اسکول بھی ایک پوتر مقام ہے......جو بچّے پورے جذبات سے دینی تعلیمات حاصل کرتے ہیں۔ اِن کی زندگی پُرسکون رہتی ہے۔ اُن کا آخرت سنورتا ہے......اور جو بچے اسکولوں میں محنت و لگن سے دنیاوی تعلیمات حاصل کرتے ہیں۔ اُن کا مستقبل روشن اور زیادہ تابناک ہو کر سورج، چاند، ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔ اُن کی

دسویں جماعت میں پڑھتے ہو۔میں تو تب کی بات کرتا ہوں جب تم معصوم تھے۔ناسمجھ تھے۔
کیا تم تب کا کوئی اندازہ کر سکتے ہو۔کہ تب تمہارا داخلہ کیا سوچ کر کروایا گیا ہوگا..........؟"
"نہیں سر۔" مورپ کے دوست نے اب کی بار نفی میں سر ہلایا۔"تب ہم واقعی ناسمجھ رہے ہوں گے۔"
"یہی تو......میں یہی تو سمجھا رہا ہوں کہ تب تم معصوم تھے، ناسمجھ تھے۔اپنی آئندہ کی زندگی سے بے خبر، بے پرواہ.....اپنے کھیل تماشوں میں مگن......بھوک لگے تو کھا لینا...... پیاس لگے تو پی لینا......اُوب گئے تو کھیل کر تسلّی کر لینا یہی سب تو تمہارے شوق میں شامل تھا......بچپنے میں ایسا ہی ہوتا ہے......بچپن میں کسی کو بھی اپنی ماضی کی فکر نہ رہی ہے نہ رہے گی۔
لیکن والدین ہمیشہ اپنے معصوم اولاد کی ماضی کے لئے فکرمند رہتے آئے ہیں۔سبھی دوراندیش والدین اپنے بچوں کو اونچی سے اونچی تعلیم دلا کر سماج میں عزت دار، نامدار کامیاب ڈاکٹر، انجینئر اور سرکاری بلند پایہ آفیسر بننے کی حسرت دل میں جمائے رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کم سنی میں اپنے بچوں کو پیار پچکار سے اُنگلی پکڑ کر اور نہ ماننے کی صورت میں ننھے ننھے کان پکڑ کر دل میں ہزاروں ارمان لئے بہتر مستقبل کی آرزو میں اسکول میں داخلہ کروا لیتے ہیں۔اور پڑھ لکھ کر پروان چڑھنے تک اُن کی ہر جائز ناجائز مطالبات پوری کرنے سے نہیں ہچکچاتے ہیں۔تمہارے والدین نے بھی یہی سب سوچ کر تمہیں اس اسکول میں داخلہ دلوایا ہوگا..........اب اگر تم اُن کی اُمیدوں پر کھرا اُترنے کے بجائے نیچ حرکتوں میں وقت برباد کرتے پھرو گے تو سوچو اُن پر کیا گذرے گی......افسوس ہے تم پر......میں سب کی بات نہیں کرتا۔صرف اُن چند بچّوں کی بات کرتا ہوں۔جو اپنی اوچھی حرکتوں سے باز نہیں آتے......اُن سے نہیں جنہیں اپنے والدین کے دُکھ درد کا......اُن کے سپنوں اور ارمانوں کا احساس ہے۔
لیکن تم سب اکھٹے پڑھتے آئے ہو۔دُکھ سُکھ میں ساتھ رہے ہو......تو کیا اپنے لئے اچھا اور دوسروں کے لئے بُرا سوچنا تمہیں شوبھا دیتا ہے..........؟"

ساری کلاس میری جانب ہمہ تن گوش تھی۔ میں کہے جارہا تھا۔

"......کیا خود کو نیک اور اسے بد یا بدکردار بنتے دیکھنا تمہیں راس آئے گا......؟ یاد رکھو۔ خود کو ڈاکٹر، انجینئر اور اپنے دوست کو مریض لادوا، سڑک چھاپ، آوارہ، چور، جنگجو، قاتل بننے تک کی مہلت دینا تمہارے ضمیر کی ہار ہوگی......اگر ایسا ہے تو تم سبھوں کے لئے شرم کی بات ہے......تمہاری دوستی، دوستی نہیں ایک ڈھکوسلا ہے......دوستی کے نام پر دھبہ ہے......اگر ایسا ہے تو تم سب خود غرض ہو۔ مطلبی ہو......لیکن یاد رکھو یہی دوست جب کل تمہارے معاشرے میں بدمعاش اور قاتل کے نام سے پکڑا جائے گا۔ آوارہ گردی اور شرپسندی کے نام پر سلاخوں کے پیچھے دھکیلا جائے گا۔ تب تمہارے گاؤں کی کتنی رسوائی ہوگی......تب تمہارا زندہ ضمیر اپنے دوست کی حالت زار پر تمہاری ملامت ضرور کرے گا......تمہارے سینے پر پچھتاوے کے آرے چلیں گے لیکن تم تڑپ کر افسوس کرنے کے سوا کچھ نہ کر پاؤ گے......اس لئے رگزن کے ہم جماعتو۔ اب بھی وقت ہے۔ خدارا رگزن کے ماضی کو تاریکیوں اور تباہیوں سے بچاؤ......اسے سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرو۔ دوستی کے ناطے سمجھاؤ۔ نہ سمجھے تو سمجھانے کا کوئی راستہ بناؤ......ڈر کے مارے اِس کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے مزید نہ بگاڑو......میں اسے سدھارنا چاہتا ہوں۔ اسے سدھارنے میں میری مدد کرو......کوئی تو بتادو اس نے چھورول کو کیوں رُلادیا ہے۔"

سبھی خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ اُنہیں خاموش پا کر میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"مندر، مسجد، گونپہ اور گرجا کی طرح اسکول بھی ایک پوتر مقام ہے......جو بچّے پورے جذبات سے دینی تعلیمات حاصل کرتے ہیں۔ اِن کی زندگی پُرسکون رہتی ہے۔ اُن کا آخرت سنورتا ہے......اور جو بچے اسکولوں میں محنت و لگن سے دنیاوی تعلیمات حاصل کرتے ہیں۔ اُن کا مستقبِل روشن اور زیادہ تابناک ہو کر سورج، چاند، ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔ اُن کی

زندگی سنور جاتی ہے۔لیکن اگر کوئی ان پوتر مقامات کی بے حرمتی کر جائے تو ان کے حصے میں ذِلتوں، بے چینیوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں لگتا...... یہ اسکول بھی ایک پوتر مقام ہے۔آج اس میں جو اوچھی حرکت ہوئی ہے۔اِس کا ازالہ ضروری ہے۔ورنہ اس کے بدترین اثرات سے تم سبھوں میں اچھا بُرا کوئی بھی نہیں بچ پائے گا......رسوائی اور ناکامی تم سبھوں کے حصے میں ضرور آئے گی......اِس لئے اس کے ازالے کے لئے کم سے کم کوئی تو بتادو کہ رگزن نے ایسا کیا کر دیا کہ چھورول خون کے آنسو روتی ہوئی دفتر میں فریاد کرنے چلی آئی۔تاکہ میں خود اس کا ازالہ کر کے تم سب کو ماضی کے بُرے اثرات سے بچا سکوں اور رگزن کو بھی آئندہ کے لئے باز رکھنے کا کوئی طریقہ اختیار کر سکوں۔“

مورپ کے دوست نے مُڑ کر رگزن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔پھر پورے کلاس کا ہلکا سا جائزہ لے کر اندازہ لگالیا کہ اب کلاس میں پہلے جیسی گھبراہٹ نہ رہی تھی۔کیونکہ سارے طلباء و طالبات مُڑ مُڑ کر رگزن کی نگاہوں کا بے خوف مقابلہ کر رہے تھے۔اور اب رگزن بھی ان سب کی باغی نگاہوں سے گھبرا چکا تھا۔کلاس میں کئی لڑکے اُس راز پر سے پردہ ہٹانے کے لئے پر تولنے لگے جو ابھی کچھ دیر پہلے چھورول کے ساتھ رونما ہوا تھا............ اتنے میں کئی لڑکے پُر جوش انداز میں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔اِن میں مورپ کا دوست ٹشی، ژھےتن، اور رگزن کا دوست نمگیل بھی تھا۔

ٹشی نے کہنے میں پہل کی۔

”سر.........میں بتاؤں گا سر۔پنڈت جی ہمیں پڑھا رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُنہیں بلوا بھیجا۔وہ فوراً ہی چلے گئے تو سر......تو سر......“

ژھےتن نے ٹشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں بتاتا ہوں سر...... پنڈت جی کے جانے کے بعد ہم سب اپنی اپنی کتابوں کا خود ہی مطالعہ کرنے لگے کہ اچانک رگزن نے مذاقاً ”Stand Up“ کہہ دیا............“

رگزن کے دوست نمکیل نے جھٹ سے وانگیل کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور خود کہنا شروع کیا۔

"............ہاں سر۔اس کے اسٹینڈ اپ کہتے ہی ہم چونک پڑے اور پھرتی سے یہ سوچ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کہ شاید پنڈت جی کلاس میں لوٹ آئے ہیں۔لیکن جب کھڑے ہو کر دروازے کی جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔اس نے ہم سے مذاق کیا تھا۔"

اتنے میں سنپھل اُٹھ کر بولنے لگا۔

"سر یہ ہمیشہ بے ہودہ مذاق کرتا رہتا ہے۔اس بار بھی ہمیں اس کا مذاق اچھا نہیں لگا۔اور جب ہم بُرا سا منہ بنا کر بیٹھنے لگے۔تو اس نے پاؤں مار کر چھورول کی اسٹول لڑھکا دی............"

اس کے بعد ذرا سی خاموشی چھا گئی۔چھورول شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔سبھی ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر آگے کہنے کے لئے ہمت جٹانے لگے۔کیونکہ اب کے کہے جانے والا جملہ ہی گہری اہمیت کا حامل تھا۔اسی جملے میں وہ بے تکی بات عیاں ہونے والی تھی۔ جسے سُن کر میرے صبر کا بندھ ٹوٹنے والا تھا۔آخر کار بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے ایک لڑکا ہمّت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔اور کہنے لگا۔

"سر۔چھورول کی اسٹول لڑھکتے ہی وہ گرنے لگی تو رگزن نے لپک کر اُسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔اور کچھ دیر شوخی بھری شرارت اور بے حیائی سے سینے سے چپکائے رکھا......وہ مچلی ......چھٹپٹائی......لیکن اس نے چُمی لئے بغیر نہ چھوڑا۔"

"بس بس بچّو میں سمجھ گیا......اب تمیں مزید بیان دینے کی ضرورت نہیں......میں اس جرأت کے لئے تم سب پر بے حد خوش ہوں اور سبھوں کو شاباشی دیتا ہوں......آج مجھے معلوم ہوا......کہ تم زندہ ضمیر کے مالک ہو۔تم سبھوں کے خواہشات رگزن کے لئے بُرے نہیں ہیں۔اب تم بیٹھ جاؤ۔اور تم" رگزن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔......"تم بتاؤ۔تم نے ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی..........؟"

رگزن کھڑا تو تھا لیکن سرکشوں کی طرح خاموش رہا۔
اُس کا جی چاہا کہ رزلٹ کے دن مجمع میں چھورول اور میرے درمیان ہونے والے مشکوک اشاروں کا پول کھول دے۔ مگر شاید جُرات نہ ہوئی......
میرے ہاتھ میں بید کی پتلی سی چھڑی تھی جسے اب میں نے چاروناچار رگزن پر گھمانے کا انداز بنایا۔ کبھی اُس کے اعضاء پر ہلکے وار کیئے۔ کبھی چھڑی کو فرش اور قریبی اسٹولوں پر ادھر اُدھر مار کر اس کے پاؤں اور ٹانگوں پر گھما گھما کر جمانے کی جھوٹی اداکاری کی۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا کہ ٹس سے مس نہ ہونے والا ڈھیٹ لڑکا دہائیاں دے دے کر معافیاں مانگنے پر مجبور ہوا۔
اس کے معافیاں مانگنے کے انداز پر غصے کے باوجود میرے دل میں جذبہ شفقت نے جوش مارنے کی کوشش کی۔ اپنے احساسات قابو میں نہ رکھتا تو ساری محنت رائیگان چلی جاتی ۔ کیئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ پس ہمدردی جتانے کے بجائے کمال ضبط ہوشیاری کے ساتھ دھتکار اور ملامتی عمل سے دباؤ میں کوئی کمی نہ آنے دی۔
"کم بخت......ایسا کرنے کی جرات کیسے ہوئی......کیوں ایسی گھناونی حرکت کی...... اسکول کو مذاق سمجھ رکھا ہے......؟"
"بھول ہوگئی سر......اس بار معاف کیجئے۔"
"آئندہ پھر کوئی غلطی تو نہیں کروگے............؟"
"نہیں سر............"
"دوبارہ شکایت کا موقع تو نہیں دوگے............؟"
"بالکل نہیں سر......کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا۔"
"تو چلو۔ دفتر میں ہیڈ ماسٹر صاحب اور سبھوں کے سامنے معافی مانگو۔"

"سر نہیں آپ سے معافی مانگوں گا نا سر..........اس بار آپ ہی معاف کیجئے سر......"

"بالکل نہیں ......وہیں چلنا پڑے گا......تا کہ اُن کے دلوں سے تمہاری نفرت مٹ جائے اور وہ تمہارے خلاف کوئی کاروائی نہ کریں..........چلو میرے ساتھ......" میں اُسے کلائی سے پکڑ کر دفتر میں لے آیا۔

ابھی لنچ بریک کی گھنٹی نہ بجی تھی۔ پھر بھی دفتر میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے علاوہ کئی ماسٹر صاحبان اپنا اپنا پیرڈ ختم کر کے کریکشن ورک میں جُٹے تھے۔ اُسے کان سے پکڑے دفتر میں گھسا ہی تھا کہ سبھوں کی حیرت بھری آنکھیں ہم دونوں پر اُٹھیں ....شاید انہیں اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔ میں نے کلائی کا پکڑ چھوڑ کر بید سے دوبارہ ہلکے وار جماتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"آگے بڑھو۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور سارے ماسٹروں سے معافی مانگو۔"

وہ اپنا انگ انگ سہلاتا' میرے وار بچاتا ہوا اچھل کر نور بو صاحب کی چوبی میز کے قریب پہنچا......اور ہاتھ جوڑ کر معافی کی بھیک مانگتا ہوا بولا۔

"سر اس بار معاف کیجئے......آئندہ کبھی غلطی نہیں ہوگی......"

ہیڈ ماسٹر صاحب اُسے نظر انداز کر کے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"وسیم صاحب کچھ معلوم ہوا کیا غلطی کی تھی۔؟"

"جی ہاں کیسے معلوم نہ ہوتا..........میں نے بڑے بڑوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے ہیں ....اس کی بد معاشی نا قابل معافی ہے......لیکن اسے سُدھرنے کا ایک موقع دے دیجئے......اب کی بار اسنے غلطیاں نہ دہرانے کا وعدہ کیا ہے۔"

سارے اساتذہ لگ بھگ یک زبان ہو کر پوچھ بیٹھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر یہ بتایئے اس کی بد معاشی تھی کیا۔؟"

"کیا بتائیں مجھے تو کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے......یہ بد بخت پچھلی قطار میں چھوروں

کے ٹھیک پیچھے بیٹھا تھا...... کسی طرح سے اس نے اس کا اسٹول لڑھکا دیا۔ وہ ڈگمگا کر گرنے لگی تو کمبخت نے لپک کر بانہوں میں بھینچ لیا۔ اور جھٹپٹانے پر چھوڑنے کے بجائے چُمی لے ڈالا......"

ہیڈ ماسٹر صاحب دانتوں میں اُنگلی دبا بیٹھے۔ کچھ دیر اُس کی طرف بغور دیکھتے رہے۔ پھر دفتر میں موجود سارے اساتذہ کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آپ سبھی بتائے اس کا کیا کیا جانا چاہئے۔؟"

"جناب ہیڈ ماسٹر صاحب......"

ماسٹر دور جے اُن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "اگر جسم کا کوئی حصّہ ناسور بنے تو اُسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی طالب علم اسکول کے لئے ناسور بنے تو اُسے سٹوفکیٹ تھما کر رخصت کر دیا جانا چاہیئے۔ ورنہ دوسرے بچے بھی اس لت کا شکار ہو کر بگڑ جائیں گے۔"

اسکول کے لاما جی جو بُدھک ٹیچر تھے........... جنہیں سبھی لوگ احتراماً (اجنگ لے) یعنی ماما جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے بھی تلملا کر بولے۔

"اسے دفع ہی کر دینا چاہئے...... بے حیا گنہگار نے تو بھگوان مہاتما بدھ جی کے فرمان کا بھی پاس نہ کیا............ چھی چھی چھی......"

سردار گوربچن جی کا پارہ بھی بڑھ گیا۔ وہ بھی جل بھُن کر خالص پنجابی لہجے میں بولے۔

"اوئے بے شرما...... تنوں (تجھے) کتنی نصیحتیں کیں میں نے........... کہ اب اگے بورڈ اے (ہے)۔ سارا دھیان شیطانی ارکتوں سے اٹا کر (حرکتوں سے ہٹا کر) پڑھائی پر لگا دو............ اوئے روج روج تیرے کو سمجھا تاریا (ارے روز روز تجھے سمجھا تا رہا)...... اوئے کھوتے (خچر)...... تیری دماغ گھاس چرنے جاتی اے (ہے) کیا...... اوئے بد بختا کب سمجھ میں آئے گا تینوں (تجھے)...... اوئے کھوتے دی طرح سر جھکا کے سُنتا ریتا (ارے گدھے کی طرح سر جھکا کے سنتا رہتا) تھا۔ پر تری شکل کو دیکھ کر مینو ملوم (مجھے معلوم) تھا کہ تو سدھرے گا نئیں (نہیں)............ اوئے کُتے دی دُم...... تیرا کی بنے گا اوئے (ارے کتے کی دم تیرا کیا بنے گا)............؟'

سردار گور بچن سنگھ خاموش ہوا تو ہیڈ ماسٹر نور بو صاحب غُصے میں بولے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے دماغ میں کون سا کیڑا کلبلاتا رہتا ہے۔اپنے ساتھ دوسرے بچوں کو بھی بگاڑتا جاتا ہے...... بڑا تنگ کر دیا ہے سب کو...... ہر کوئی اسی کی شکایت لے کر بیٹھ جاتا ہے...... سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکے ساتھ کون سا سلوک کیا جانا چاہیئے......!"

دفتر میں موجود سارے اساتذہ ایک ساتھ بولے۔

"جناب اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں........... ڈسچارج سٹرٹیفکیٹ تھما کر چلتا کر دیجئے۔نہ رہے بانس نہ بجے بانسری...... ہم نے تو کافی کوشش کی تھی کہ یہ من لگا کر پڑھے...... خوب پڑھے...... لیکن اسکے نصیب میں آگے کی پڑھائی ہی نہیں تو ہمارا کیا قصور۔ رہنے دیجئے جناب...... اب بہت ہوگیا۔خواہ مخواہ میں زیادہ پریشانی لینا اچھی بات نہیں......"

ہیڈ ماسٹر صاحب کو خوب سوچنے اور ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اسے اسکول سے بے دخل کرنا ہی مناسب لگا........... اُسے تو پورے اسکول کے بچّوں کی ماضی کی فکر تھی...... لیکن میرے ضمیر نے نہ مانا۔

میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے اِس کے حق میں سفارش کرنے کی کوشش میں کہا۔

"جناب.......... میرے خیال میں اسے ایک موقع دیا جانا چاہیئے ...... اس میں کوئی شک نہیں کہ عام غلطیوں کی نسبت آج والی غلطی اِس کی پہلی بدترین غلطی ہے...... اس لئے اگر یہ بدبخت آج کے قصور کو پہلی اور آخری غلطی مان کر معافی مانگ لے۔اور ہر قسم کی شرارتوں سے باز رہنے کا وعدہ کرلے تو ہم سبھوں کی جانب سے سدھرنے کا ایک موقع دیا جانا چاہیئے"

سارے اساتذہ نے لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔پھر ہیڈ ماسٹر صاحب سے بولے۔

"ہاں جناب...... وسیم صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔اسے ایک موقع دے کر آزما لینا چاہیئے......"

ہیڈ ماسٹر نور بو صاحب نے آنکھوں سے عینک اُتار کر میز پر رکھ دی اور نگاہیں رگزن پر

مرکوز کر کے بولے۔

"بولو کم عقل......کیا بولتے ہو تم............"

"سر میں معافی مانگتا ہوں۔اس بار معاف کیجئے............آئندہ کوئی غلطی نہ ہوگی......"

"ٹھیک ہے............ہم سارے سٹاف ممبران وسیم صاحب کے کہنے پر تمہیں سدھرنے کا ایک سُنہرا موقع دے دیتے ہیں......اگر اس کے بعد بھی کوئی شکایت آگئی۔ تو سمجھ لینا اپنے نکال دیئے جانے کا راستہ تم نے خود ہموار کر دیا۔"

"ٹھیک ہے سر............"رگزن نے اقرار میں سر کو جنبش دی۔

"اب تم جا سکتے ہو۔"

رگزن جانے کے لئے مُڑا۔ پر جاتے جاتے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر چلا گیا۔

لنچ بریک کی گھنٹی بج اُٹھی............طلباء و طالبات کلاسوں سے نکل کر پیٹ کی آگ بُجھانے گھروں کو چل دیئے۔ اور میں رگزن کے اُن آنکھوں پر غور کرنے لگا۔ جن میں میرے لئے نفرتوں کے انگارے بھرے پڑے تھے۔

باب سولواں

دن بیتتے گئے۔

بچوں پر دباؤ بنا رہا۔

چھڑی کی مہربانی سے اسکول کے معیار میں بلندی آ گئی۔ بچوں کی عادتیں بدل گئیں۔ فرمانبرداری کا رجحان بڑھ گیا۔ وردی اور پوشاکیں نفس و نفیس ہو گئیں۔ شرارت پسندوں میں قدرے نرمی آ گئی۔ وقت کی پابندی اور باقاعدہ حاضری کا خیال کیا جانے لگا۔

رگزن کی قابلیت بڑھنے کے ساتھ اسکول میں اُس کی شرارتیں محدود ہو گئیں۔ البتہ اسکول سے باہر وہ اب بھی پہلے جیسا بدمزاج اور منہ زور تھا۔ اور اسی بدمزاجی کی وجہ سے اپنے دل میں میرے خلاف بدگمانی اور ضد پالے ہوئے تھا۔

میں جب بھی کلاس میں پڑھانے کے دوران اُس پر نظر ڈالتا، اُسے غصے اور نفرت بھری نگاہوں سے اپنی طرف گھورتا ہوا پا کر سوچ میں پڑ جاتا کہ اگر کبھی اس کے ہتھے چڑھ گیا تو کچا ہی چبا ڈالے گا۔

اِس کی ضد کا یہ عالم تھا کہ جس روز اُس کی بدترین خطا معاف کردی گئی تھی۔ اُس روز سے اکثر مجھے تنہا پا کر میرے تعاقب میں رہنے لگا تھا۔ میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اُس کی نادانی سمجھ کر اہمیت نہ دی۔ لیکن......ایک دن بال بال بچا۔ ہوا یہ کہ

ایک شام............

حسب معمول میں پہاڑی کے دامن میں اونچی نیچی پگڈنڈی پر تنہا خراماں خراماں ہوا خوری میں مشغول تھا کہ خلاف توقع اُس روز مجھے اپنے تعاقب میں رگزن نظر نہ آیا۔ میں یہ سوچ کر زیرلب مسکرادیا۔ کہ شاید اب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اسی لئے عقب میں نظر نہیں آرہا..........یعنی اُس کا میرے تعاقب میں نہ ہونا میری دانست میں میرے کامیاب اُستاد ہونے کی زندہ مثال میں نے خود قائم کرڈالی۔ میں زیرلب مسکراتا چھوٹے بڑے کنکروں کو غیرارادی طور پر ٹھوکریں مارتا بڑھتا چلا گیا۔

آگے پگڈنڈی دوراہے میں بٹی تھی۔ ایک پہاڑی کے دامن میں اونچی نیچی سنگریزے دار بٹیا کی طرح سیدھی چلی جارہی تھی اور آگے جا کر گاؤں میں اُترتی تھی۔ دوسری ترچھی چڑھائی چڑھتی ہوئی پہاڑی کے کوہان نما پیٹھ پر بنے، مٹی، پتھر اور گارے کے چند بودھی چھور تنوں کی قطار کے پیچھے سے گھوم کر دوسری طرف ترچھی راہ بنا کر اُترتی ہوئی پھر اسی پگڈنڈی سے آملتی تھی۔

رگزن کے بارے میں سوچتا ہوا میں اطراف کا نظارہ کرتا چلتا رہا۔ پہاڑی کی درمیانی پگڈنڈی سے گاؤں کی خوبصورتی دیکھنے لائق تھی......اوپر نیلا آکاش بھی شیشے کی طرح بادلوں سے پاک اور روشن تھا۔ حالانکہ سورج کے دوسری طرف اُترنے سے پہاڑی کے سائے آدھی بستی تک اُتر آئے تھے۔

شام کے چھ بجے ہوں گے۔

پگڈنڈی پر میرے سوا کوئی نہ تھا۔

چلتے چلتے ٹھیک چھورتنوں کے نیچے سے گذر ہی رہا تھا۔ کہ اوپر چھورتنوں کے قریب سے دو تین بڑے پتھر گرد و غبار اُڑاتے ہوئے تیزی سے نیچے کو لڑھکنے لگے......ان پتھروں کے لڑھکنے سے چھوٹے بڑے سنگریزوں کا ایک ریلا آندھی طوفان کی طرح شور مچاتا مجھے روندھنے میری طرف بڑھا......موت کے ڈر سے ہمت جواب دے گئی......میری سمجھ میں کچھ نہ سوجھا...... بس مبہوت سا کھڑا موت کو یقینی مان لیا...........

مجھے لگا کچھ ہی دیر میں سنگریزوں کے طوفانی ریلے کا ایک بڑا اور بھاری سا ڈھیر مجھ پر آ بیٹھے گا۔ اور میں ہمیشہ کے لئے زندہ درگور ہو کر لاپتہ ہو جاؤں گا...........موت اور زندگی کے بیچ صرف چند قدم کی دوری تھی۔ ریلے کے کئی کنکر اُچھل کر مجھ تک پہنچنے لگے ایک آدھ نے مجھے زیر کیا ہی تھا کہ اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے پُھرتی سے دھکیل کر آگے دوڑا دیا...........

پتھروں اور سنگریزوں کا ریلا پورے زور و شور کے ساتھ چند سنگریزے چھینٹوں کی طرح ہم دونوں پر اُچھالتا، پھینکتا ہمارے پیچھے سے گڑگڑاتا نیچے چلا گیا۔ اور ایک دوسرے پر چڑھ کر ڈھیر سا بن کر شانت ہو گیا۔

گھبراہٹ کے مارے میری جان ہی نکل گئی تھی......میں ہکا بکا سا مڑ کر اپنے محسن محافظ کو دیکھنے لگا......یہ کوئی اجنبی نہیں، میرے اسکول کا فونچک چپراسی تھا۔

ہم دونوں زخمی ہو چکے تھے۔

میرے سر سے خون اُبل پڑا تھا۔ بازو میں چوٹیں آئی تھیں۔

چوٹ کے درد سے میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ میں نے دیکھا فونچک بھی درد کے مارے سسکاریاں لے رہا ہے۔

سنگریزوں نے اُس کی پیٹھ، ٹانگوں اور سر کے پچھلے حصے کو نشانہ بنایا تھا۔ بازوں پر بھی خراشیں تھیں۔ نوکیلے پتھروں کی چوٹوں نے ماتھے اور ناک کو بھی چھیل لیا تھا۔ شاید بائیں کنپٹی سے خون بھی بہہ نکلا تھا۔

میرے خوف سے پھٹی نگاہیں پہاڑی کے نیچے رُکے پڑے اُس شانت ڈھیر کی طرف اُٹھیں جو ابھی کچھ پل پہلے کہرام مچاتا اوپر سے نیچے لڑھکتا آیا تھا۔ میں نے پلٹ کر فونچک چپراسی کی طرف مشکور و احسان مند نگاہوں سے دیکھا...... آج وہ نہ ہوتا تو میں پتھروں اور سنگریزوں کے ڈھیر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر کوئی بھولی بسری کہانی بن چکا ہوتا۔ میری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی ہوتی..........

''ماسٹر صاحب یہاں بیٹھو ۔من شانت ہوگا۔''

اُس کا اشارہ کنارے پڑے پتھر کی سِل کی طرف تھا۔

میری نگاہیں آسمانوں میں اپنے کرشمہ ساز رب ذوالجلال کا شکر ادا کرنے کے لئے اُٹھیں ۔ پھر ہاتھوں میں سر پکڑے پتھر کی سِل پر بیٹھتا ہوا اپنے محافظ فونچک کی طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھا تو آواز خود بخود بھر آ گئی۔

''فونچک تم نے میرے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی میرے لئے موت سے ٹکرا گئے۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میری جان بچا کر تم نے بڑا احسان کیا ہے...... میں زندگی بھر تمہارا ابھاری رہوں گا۔''

''ماسٹر جی۔ اُبھاری کا کوئی بات نہیں۔ ہم نے دُور نیچے سے اوپر مانے کے پیچھے کوئی بندہ دیکھا۔ جو دو بڑا پتھر پکڑ کر چھپا تھا۔ اور بار بار آپ کو دیکھتا تھا........... ہم ڈر گیا جی...... ہم نے سوچا اگر وہ پتھر آپ پر گرا تو مصیبت ہو جائے گا...... اسی لئے ہم دوڑ کر آیا آپ کو خبر دینے۔ مگر تب تک وہ بد بخت دونوں پتھر کو دھکا دے کر چھوڑ دیا...... ہم بھگوان کا شکر کرتا ہوں جی کہ آپ بچ گیا۔ ورنہ ہمارا مانے ، ہمارا چھورتن بدنام ہوتا تھا ماسٹر جی......'' فونچک نے ایک پل سانس لینے کے بعد بڑی سادگی سے کہا۔

''ہمارا بھگوان ظالم نہیں ہے۔ وہ سب کا رکھشا کرتا ہے۔ بڑا مہان ہے جی وہ...... اُسی نے ہم کو دوڑایا۔ آپ کا رکھشا کرنے کا واسطے......''

بھولا بھالا فونچک اوپر چھورتنوں کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

"............لیکن ہم حیران ہوں کہ وہ کُتا کا بچہ کون تھا۔ جو ایسا ظالم حرکت کیا...... بہت کمینہ تھا وہ۔ آپ کا جان لے لیا تھا...... آپ پُولُوس میں رپٹ کرنا چاہیئے......"

فونچک کی حیرت کے برخلاف میں پوری طرح جان گیا تھا کہ یہ جان لیوا حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔ لیکن میں نے اس راز کو پوشیدہ رکھنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ کیونکہ راز فاش کرنے سے اُس کی جُرات مزید بڑھ جاتی۔ اور شاید عیاں ہونے کی صورت میں کُھلم کُھلا مرنے مارنے پر بھی تُل جاتا۔ راز میں رکھنے سے کم سے کم اُس پہ راز کُھلنے اور ابالے کے ناراض ہونے کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا۔

یہی سوچ کر میں نے فونچک سے کہا۔

"جانے دو فونچک ......کوئی بھلا جان بوجھ کر تھوڑے ہی ایسا کرے گا۔ شاید غیر ارادی طور پر ہاتھ لگنے سے سارے پتھر لُڑھک آئے ہوں...... آؤ۔ میرے ڈیرے چلو۔ وہیں تمہاری بھی مرہم پٹی کروں گا۔"

"ہم ہوتا تو......"

فونچک غصے میں بولا۔ "......ہم ہوتا تو ظالم کو پُولُوس کے حوالے کرتا جی۔ لیکن آپ مہان ہے۔ مجرم کو معاف کر دیا............ ہم نے سُنا ہے معاف کرنے والا مہاتما ہوتا ہے۔ لیکن آپ تو آدمی ہو کر معاف کر دیا...... آپ بھی مہاتما ہونے کو سکتا ہے......"

ہم دونوں ماتھے کے خون رومال سے صاف کرتے ہوئے لوٹ آئے۔

میں نے اکرم کو پھسلنے کا بہانا بتایا۔

لیکن فونچک چپراسی کے دل میں رہ رہ کر سوال اُٹھتا رہا کہ آخر...... وہ کون تھا۔؟

شام ڈھل چکی تھی۔

باب ستاروان

دوسرے دن اسکول میں رگزن کا سلوک ایسا شریفانہ رہا۔جیسے بھول کر بھی بڑی تو کیا چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی نہ کرتا ہوگا۔لیکن پھر بھی اس شریف بدمعاش کی چور نگاہیں بار بار میری جانب اُٹھتی رہیں۔ جسے میں نظرانداز کرتا رہا۔یا جان بوجھ کر انجان بنتا رہا۔

میں نے شام کے جان لیوا حملے کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔نہ ہی فونچک کو چرچا کرنے کی اجازت دی۔لیکن وہ بھلا کب ماننے والا تھا۔سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیل چکی تھی۔اساتذہ کرام،گاؤں کے مردوزن ، چھوٹے بڑے لاماجی سبھوں نے افسوس کیا...... کچھ لوگ تو اسکول میں ہی مزاج پُرسی کو چلے آئے۔اور اس ناروا سلوک کے مجرم کا اَتہ پتہ پوچھنے لگے...... میں نے انجان بن کر ٹال دیا۔ورنہ شاید وہ کوئی اقدام کر لیتے ...... اکرم میری غلط بیانی پر حیران تھا۔میں نے اُسے حیران ہی رہنے دیا۔

سوچ رہا تھا کہ اس نازیبا حرکت سے خود رگزن کو بھی شرمندگی کا احساس ہوا ہوگا۔اور کیا

عجب کہ اپنی غلطی کی تلافی کے لئے معافی مانگنے کا ارادہ بھی کر لے......لیکن ایک دن میرے سارے اندازے تب خیال خام ہو گئے۔ جب اکرم اور میں شام کو گاؤں سے چہل قدمی کر کے لوٹے اور شام کا کھانا پکانے میں مشغول ہو گئے۔ اکرم ترکاری کاٹنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹو و سلگا لیا۔ اور اب اسٹو کے برنر کی آنچ نے رفتار پکڑی ہی تھی کہ ہماری کھڑکی کے شیشوں میں زبردست چھنا کہ ہوا۔ بہت سارے کانچ کے ٹکڑے اُچھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

اکرم کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ کانچ کے ٹکڑے اُچھل کر اُس کے بازوں میں چُبھ گئے۔ کافی خون بہہ نکلا......شُکر ہے آنکھیں بچ گئیں۔ کسی نے پتھر مارا تھا۔ جانے کس بدمعاش کی شرارت ہوگی۔ ایسا واقعہ اب تک کبھی نہ ہوا تھا......

ایک پل کے لئے رگزن کا خیال آیا۔ ایسے اوچھے ہتھکنڈے اُس کے سوا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔

اگلے دن یہ خبر پھیل گئی کہ یہ شرارت رگزن نے ہی چند سر پھرے لڑکوں کے ساتھ مل کر کی تھی۔ یہ سُن کر بہت غصہ آیا۔ لیکن پردیس کے خیال سے سہم گئے۔ اور یہ سوچ کر اس شرارت کی شکایت بھی کسی سے نہ کی کہ کہیں بات نہ بڑھ جائے۔

یہ خبر چھورول کے کانوں میں پڑی تو نہ صرف بے چین ہو گئی بلکہ غصے میں لال پیلی ہو کر رگزن سے لڑنے چل دی۔ اور بھپری ہوئی شیرنی کی طرح ہر ممکنہ جگہوں پر اُسے تلاش کرنے لگی۔

رگزن اتفاق سے اوپر کے چشمے پر مٹر گشتی کرتے مل گیا تو وہ دھمکاتی ہوئی بولی۔

"اے رگزن..........اگر میرے ماسٹر جی کو کچھ ہو گیا تو یاد رکھنا کچا چبا ڈالوں گی۔"

"کس کو چباؤ گی......؟ مجھ کو یا ماسٹر جی کو......؟"

"تجھ کو چباؤں گی۔ تجھ کو۔ یاد رکھنا میری بات۔"

"کوئی وجہ..........؟" اُس نے پوچھ کر ترچھی نگاہ سے دیکھا۔

"اپنے اُستاد پر جان لیوا حملے کرنے والا کوئی بدنصیب ہی ہو سکتا ہے۔ تم جانتے ہو اُستاد کا مقام کیا ہے۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔"

چھورول شیرنی کی طرح گرجی تو وہ احمقوں کی طرح بتیسی دکھانے لگا۔ پھر بھرپور طنز سے بولا۔

"جس دم تم دونوں نین ملار ہے ہوتے ہو۔ اُس دم اُستاد کا مقام سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہوں......"

"خبردار جو اُس فرشتے کے بارے میں ایک لفظ بھی غلط کہا تو............"

"میں اُس ایک کے بارے میں نہیں تم دونوں کے بارے میں کہتا ہوں۔"

چھورول اُس کی بے باک بات سُن کر چیخ پڑی۔

"رگزن اپنے منہ کو لگام دو..........ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔.....ماروگی......مجھے پیٹو گی۔؟"

"تم باز نہ آئے تو میں چھوڑوں گی نہیں......وہ پردیسی ہے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہمارے گاؤں میں مہمان ہے۔ مہمان کی بے عزتی انسان تو کیا دیوتاؤں کو بھی پسند نہیں......"

"مہمان تمہارا ہوگا۔ میرا نہیں۔ میرا تو دشمن ہے دشمن نمبر ایک۔ جب سے آیا ہے۔ ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑا ہے۔ بار بار دھتکارا ہے۔ پیٹا ہے۔ مجھے موقع ملا تو میں چھوڑنے والا نہیں......"

"کیوں پاگلوں کی طرح بات کرتے ہو۔ تجھے دھتکارا ہے تو غلط حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے...........پیٹا ہے تو کامیاب انسان بننے کے لئے......اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ تم اکیلے تھوڑے ہی پٹے ہو۔ اور بھی تو لڑکے ہیں۔ وہ تمہاری طرح کیوں نہیں سوچتے؟"

"میں اُن سے الگ ہوں۔ تم اپنے دیوانے کی طرف داری مت کرو"۔ رگزن نے جل بُھن کر کہا۔ "میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔"

"کیا اناپ شناپ بکتے ہو۔ وہ میرے اُستاد ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ تمہارا اُستاد بھی ہے۔ اور۔ اور۔ کچھ اور بھی۔"

"کچھ اور کیا..........." چھورول کو ایک بار پھر تاؤ آ گیا۔

"کچھ اور وہی...........جو چاہنے والوں میں ہوتا ہے۔"

"رگزن تم حد سے بڑھ رہے ہو............"

''نہیں بھئی...... میں تو اپنی جگہ سے ہلا ہی نہیں ہوں۔ یہ دیکھو۔''

پہلے تو رگزن نے بتیسی دکھائی۔ پھر احمقانہ حرکتیں کرتا ہوا بولا۔

''دیکھو نا ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا ہوں۔ جس دن بڑھوں گا نا۔ اُس دن کوئی مائی کا لال نہیں روک پائے گا۔''

چھورول پیر پٹک کر بولی۔

''تم بڑے بدتمیز ہو۔ تم سے تو بھگوان ہی سمجھے......''

پھر دھمکا کر کہنے لگی۔ ''یاد رکھو۔ اگر میرے پردیسی ماسٹر جی کا بال بھی بیکا ہوا نا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔''

''ہاں ہاں۔ تم نمبردار کی بیٹی ہونا۔ سارے گاؤں پر تمہارے باپ کا راج جو ہے...... تم کچھ بھی کر لو۔ میں ڈرنے والوں میں سے نہیں۔ ایک دن اُسے دیکھ لوں گا۔''

''رگزن......''

چھورول چیختی ہوئی ہاتھوں کی اُنگلیوں کا شکنجہ بنا کر اُس کے گردن پر جھپٹی...... ''میں تجھے مار ڈالوں گی۔ تمہارا خون پی جاؤں گا............''

رگزن نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا۔ اور چھورول کو دونوں بازوں سے جکڑ کر رومانی انداز میں دھیرے سے بولا۔

''بڑی ہمدردی ہے اپنے دوست کے لئے۔''

''وہ میرا اُستاد ہے اور مہمان بھی۔'' جواب دیتے ہوئے چھورول کا لہجہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

''ہوگا۔ لیکن مجھے یقین نہیں...... چلو جانے دو...... آؤ ہم آج سے دوستی کر لیں۔''

''دوستی گئی باڑ میں...... تم جیسے کمینے سے تو شیطان بھی پناہ مانگے۔ دھت ہے تجھ پر۔ دیوتا سمان اُستاد کے جان کا دشمن بنتا ہے۔ بودھ ہو کر انسان کو تکلیف پہنچانے کا سوچتا ہے...... ارے پاپی...... پُشتک میں تو چرند پرند اور کیڑے مکوڑے تک کی حفاظت کے لئے لکھا گیا ہے

اور تم ہو کہ۔"

رگزن بے باکوں کی طرح دانت دکھاتا رہا۔ پھر جب چھورول خاموش ہوئی تو اُس کے دونوں بازوں کو چھوڑ کر چڑاتے ہوئے بولا۔

"اتنا گیان ہے تو جوگن بن کے گپنے میں ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں چلی جاتی۔؟"

"ارے مُورکھ تو اپنی بات کر۔ نرک میں جائے گا نرک میں۔"

رگزن دوبارہ چڑاتے ہوئے بولا۔

دونوں کی بات کیوں نہ کروں ...... ہم دونوں ایک ہو گئے تو سورگ میں جائیں گے...... اچھا چل جانے دے۔ آ چل آج سے ہم ہمیشہ کے لئے دوست بن جائیں۔ لا ہاتھ میں ہاتھ دے کر صلح کر لے۔"

"سر پھرے لڑکوں کو میں دوستی کے قابل نہیں سمجھتی۔"

"تو جیون ساتھی کے لائق سمجھ لے۔"

رگزن نازیبا حرکتوں پر اُتر آیا تو چھورول اس کے بدلتے تیور سے گھبرا گئی۔ اور "بے شرم" "بے حیا" کہہ کر کھسک گئی۔ اُسے بھاگتے دیکھ کر رگزن کے منہ سے قہقہہ چھوٹا۔ جو دیر تک فضا میں گونجتا رہا۔

باب اٹھارواں

رگزن کا حوصلہ روز بروز بڑھنے کے باوجود اسکول میں سب کچھ میری چاہت کے مطابق ہوتا چلا گیا۔ راستے میں آنے والی ساری رکاوٹیں اسٹاف کے تعاون سے دور ہو گئیں۔

اسکول کا نام خوب چمکا۔

یہاں تک کہ میرا نام ایوارڈ کے لئے تجویز کیا جانے لگا۔

مقامی لوگ خوش تھے۔ میری وجہ سے اکرم کی بھی عزت بڑھی تھی۔ رگزن کا باپ اپنے بیٹے میں تعلیمی معیار کی بڑھوتری دیکھ کر پھولے نا سمایا۔ مجھے یاد ہے۔ ہاتھ جوڑ کر میرا شکریہ ادا کرتے وقت اُسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ مجھے بھی لگا جیسے میں رگزن کے دل میں پلنے والی نفرت اور عداوت کی آگ سے بے پرواہ ہو کر خوشیوں کی سمندر میں غوطہ زن رہنے لگا ہوں۔

گاؤں کے مرد وزن، دیسی مکھن، تازہ سبزیوں اور پھلوں کے معاملے میں ہم پر کچھ زیادہ مہربان ہوئے۔ انڈے، دودھ، دہی کی تو گنتی ہی کیا......

کوئی کچھ نہ دے سکا تو آشیرواد کے ساتھ ڈھیر ساری دُعائیں اور نیک کامنائیں دے گیا۔

ہماری گویا پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

بس مزے ہی مزے تھے۔

یہ سب میری اپنی محنتوں کا پھل تھا۔

کہتے ہیں نا آپ بھلے تو جگ بھلا۔

ہم اچھے تھے تو لوگ بھی اچھائی سے پیش آئے۔

لوگ ویسے بھی اچھے اور ملنسار تھے۔

وادی کشمیر تو کیا ہندوستان کے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات اور منافرت بھلا کیسی ہی بھیانک صورت کیوں نہ اختیار کرلے۔لداخ کی مذہبی رواداری اور بھائی چارے میں تب تک دراڑ نہیں پڑسکتی جب تک کسی بدطنیت کی نِگاہِ بد کا اثر حاوی نہ ہوجائے۔ماضی کی متعدد سیاسی و غیر سیاسی تحریکوں میں یہاں اِس پورے خطے میں بلا کا صبر و تحمل دیکھنے اور سُننے کو ملتا رہتا تھا۔ لیکن......اب کی بار جانے کیا ہوا کہ ایک لُچے لفنگے کی حرکتوں سے ہلچل مچ گئی۔جو چند مفاد پرست عنصروں کی ملی بھگت سے ہڑتال، مار دھاڑ، اور توڑ پھوڑ کی نذر ہوگئی......تحریک کی تیزی کے ساتھ ساتھ منافرت کا زہر پھیلا......اور اس شانت ماحول کو زہریلا کسی سر پھرے اقلیتی فرقے سے وابستہ آوارہ لڑکے نے اکثریت فرقے کی کسی لڑکی کے ساتھ چھیڑ خانی سے کیا۔جس سے اکثریت فرقے کے جوان طبقہ مشتعل ہوگئے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مہاتما دلائی لاما جی لداخ آئے ہوئے تھے اور چوغلمسر میں شیر دریا (دریائے سندھ) کے کنارے مذہبی پرچار میں مشغول تھے۔عقیدت مندوں کی بھاری بھیڑ گاؤں گاؤں سے اس قدر اُمڈ آئی ہوئی تھی کہ میدان میں تلِ دھرنے کی جگہ تک نہ تھی۔آس پاس کی جگہیں چھابڑی فروشوں اور خوانچہ والوں نے قبضے میں لے رکھی تھیں۔کئی جگہوں پر چھوٹے موٹے ہوٹل والے بھی خیمہ زن تھے۔سڑک کے کنارے ایک جگہ ٹیکسی اسٹینڈ بھی تھا۔ جہاں لیہہ شہر اور آس پاس کے دیہاتوں قصبوں سے آنے جانے والے مسافروں کی جھرمٹ لگی ہوئی تھی......ان ہی جھرمٹ میں ایک شوخ اور چنچل حسینہ سے ایک اقلیتی فرقے کا منچلا لڑکا ایسے ٹکرایا گویا برسوں کی پہچان ہو......چنچل حسینہ تو اجنبیوں کی طرح دیکھ کر چلی گئی مگر اُس کا غیرت مند بھائی جو قریب ہی اپنی ٹیکسی کے پاس کھڑا تھا۔جل بھن کر قریب آیا اور آتے ہی منچلے نوجوان کے ساتھ تکرار کرنے لگا۔

منچلا نوجوان ان بھائی بہن کے خونی رشتے سے بے خبر تھا۔اس لئے بدک کر بولا۔

"ابے جب تم میں سے کوئی ہماری مسلم چھوکری کے ساتھ مسخری کرتا ہے تو ہم کچھ

بولتے ہیں کیا......؟"

"کون ڈرائیور مسخری نہیں کرتا......لیکن وہ تمہاری بہن تو نہیں ہوتی نا......؟" اُس کے بھائی نے نوجوان کے سینے پر مُکہ داغتے ہوئے کہا۔

"تو یہ چھوکری تمہاری بہن لگتی ہے کیا......؟"

نوجوان نے تنک کر پوچھا تو اُس حسینہ کے بھائی نے غصے میں آگ بگولہ ہو کر اُس کی چمچماتی ٹویوٹا ٹیکسی کے بَنٹ پر کئی جگہ مُکّہ جماتے ہوئے دہرایا۔

"ہاں۔ وہ میری بہن لگتی ہے......وہ میری بہن لگتی ہے......میری بہن لگتی ہے......ہاں وہ میری بہن لگتی ہے......اب سمجھے......؟"

منچلے نوجوان کے ٹویوٹا ٹیکسی کی بَنٹ مکوّں سے دھبے دار اور بدصورت ہو گئی تو وہ غصے میں بولا۔

"اپنی گلی میں کُتا بھی شیر ہوتا ہے......تم میری گلی میں آجاؤ۔ بلی نہ بنایا تو میرا نام نہیں......"

اتنا کہہ کر اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور لیہہ کی طرف دوڑا دی اور دل ہی دل میں اب وہ حسینہ کے بھائی سے بدلہ لینے کے تانے بانے بُننے لگا۔

حسینہ کا بھائی بے غیرتی کا عادی نہ تھا۔ ڈرائیور قوم تو ویسے بھی مرنے مارنے پر تُل جاتی ہے......اس چیلینج سے منہ موڑنا اُس کی توہین تھی۔ لہذا وہ بھی ٹیکسی اسٹارٹ کر کے نوجوان کے تعاقب میں شہر کی جانب چل دیا۔

شہر میں چمچماتی قیمتی کار کی بدصورتی دیکھ کر منچلے نوجوان کے بودھ مسلم دوستوں نے افسوس کیا اور جب ماجرا پوچھا تو اِسے ہی خطاوار پا کر بولے۔

"غلام بھائی غلطی تمہاری ہے جو تم نے پلدن کی بہن سے چھیڑ کی......البتہ پلدن نے گاڑی کو نقصان پہنچانے کے بجائے تمہارا ناک نقشہ بگاڑ دیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا......گاڑی کو بدصورت بنانا اُس کی زیادتی ہے......"

"دوستو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اُس کی بہن ہے......لیکن میں بھی پلدن کو دیکھ لوں گا......"

اتنا کہہ کر وہ اپنی ٹویوٹا ٹیکسی اسٹینڈ میں رکھ کر چلا گیا۔

اِدھر اُس حسینہ کا بھائی پلدن ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچا تو دوستوں نے غلام کے ٹیکسی کی حالت پر اُس کی ملامت کی۔ اور کہا۔

"کم از کم تمہیں ٹیکسی کو تو نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے تھا......غلام کی ہی مرمت کرتے تو کوئی بات ہوتی......"

"یارو غصے میں مجھے کچھ نہیں سوجھا......جو ہوا سو ہوا......اب وہ مجھے دھمکا کے چلا گیا ہے۔ میں بھی ذرا دیکھتا ہوں......" کہہ کر اُس نے بھی اپنی ٹیکسی اسٹینڈ میں کھڑی کر دی اور لیہہ کے بدنام چھنگ گلی کا رُخ کیا تا کہ خم ٹھونک کر سامنا کر سکے۔

یار دوست مناتے رہ گئے۔ لیکن کسی کی ایک نہ چلی۔

کچھ دیر بعد ہی اُن کے تصادم کا چرچا گلی بازاروں میں عام ہو گیا۔ آن کی آن میں بکھیڑا کھڑا ہوا۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ اکثریت اور اقلیت فرقہ کے طرف دار نوجوان سرکشی پر اُتر آئے۔ اِن لڑکوں کے ٹکراؤ میں شہر اور بیرون شہر کے بے خبر و بے قصور مرد و زن فرقہ پرستی کی آگ میں جُھلس گئے......دُکانیں دھڑا دھڑ بند ہو گئیں......موٹر گاڑیاں توڑ ڈالی گئیں......سوشل بائیکاٹ کا اعلان ہوا۔ قصور واروں اور بے قصوروں کا امتیاز نہ رہا۔ حالات تشویشناک ہو گئے۔

دونوں فرقہ کے دور اندیش رہنماؤں، مذہبی ہستیوں اور لیڈروں نے اس آگ کو بُجھانے کی جان توڑ کوشش کیں......لیکن مشتعل اور بے قابو نوجوانوں کے آگے ایک نہ چلی...... سرکاری مشینری بھی کمزور پڑ گئی......اکثریت کے نوجوان لڑکے ہاتھ دھو کر بے لگام گھوڑوں کی طرح اقلیتوں کے پیچھے پڑ گئے......خوب فتنہ ہوا......

فتنہ پرور چاہے مسلم تھا یا غیر مسلم۔ ایک بد بخت، کم ظرف کی سزا سب کو ملنے لگی...... سوشل بائیکاٹ ہوا تو ہر طرف ہاہا کار مچی......کیوں نہ مچتی۔ آخر اسی[80] فیصد مسلم اور غیر مسلم

خاندان کسی نہ کسی طرح آپسی رشتوں میں جو بندھے تھے اور مدتوں سے شادی بیاہ، دُکھ سُکھ، عید اور لوسر کے موقعوں پر ایک دوسروں کے پاس آجا کر آپسی دیرینہ رشتوں کی یادیں تازہ جو کرتے رہتے تھے۔

ایک بد مزاج سر پھرے کی وجہ سے سوشل بائیکاٹ کے کیا معنی......! کیا انسانیت نام کی چیز اب برائے نام رہ گئی ہے؟ کہاں گئی مذہبی رواداری......؟ کہاں گیا بھائی چارا والا لداخ؟ سوچ کر میرا دماغ گھوم گیا۔

ہمارا گاؤں جہاں ہم تعینات تھے بھی اس آگ کی لپیٹ سے نہ بچ سکا۔ لیہہ شہر سے خلسے تک شاہراہ کے اغل بغل میں بسی آباد بستیوں کے چند شرارت پسند من چلوں نے اپنا احتجاج سڑکوں پر رواں دواں مال بردار اور مسافر گاڑیوں پر قہر برسا کر پورا کیا......پتھراؤ اور مارا ماری میں لمبی مسافت کے جانے کتنے تھکے ماندے معصوم بے گناہ مرد وزن زخموں سے چور ہوئے۔ سول فورس کی کمی کے باوجود اعلیٰ منتظمان نے شہر اور اطراف سے مزید کمک پہنچنے تک حالات پر قابو پانے کی ہر ممکن جستجو کی...... بے شک قصور وار کو اُس کے کِئے کی سزا ملنی چاہیئے تھی، لیکن ایک بد بخت کے گناہوں کی سزا اتنے بے قصوروں کو دینا کہاں کا انصاف تھا۔ اکثریت طبقے کے اعتدال پسندوں نے بھی اس زیادتی پر افسوس کیا۔

میں اور اکرم دونوں ہی تیزی سے پھیلتی ہوئی نفرت کی آگ کی تپش بخوبی محسوس کرتے رہے۔ یہ آگ ہمارے دامن تک بھی آسکتی تھی۔ کیونکہ ہمارے گاؤں کی شاہراہ پر بھی مال بردار گاڑیوں کا بُرا حال کیا جا چکا تھا۔ کتنی ہی چمچماتی گاڑیاں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ کتنے ہی مسافر لہو لہان ہو چکے تھے......بچے کھچے مسافر گھبرائے اور دم بخود تھے۔

یہ صرف چند گنے چُنے سر پھرے مشتعل ہجوم کی کارستانیاں تھیں جو محض قومی شاہراہ پر جگہ جگہ ہڑ بونگ اور دہشت مچاتے ہوئے اس گاؤں تک آن پہنچے تھے۔ اور اپنی رہنمائی میں گاؤں کے چند بھولے بھالے کم سن بچوں، لڑکوں اور نوجوانوں کو جوش دلا دلا کر اُکساتے اور بارود کی

''دوستو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اُس کی بہن ہے......لیکن میں بھی پلدن کو دیکھ لوں گا......''

اتنا کہہ کر وہ اپنی ٹویوٹا ٹیکسی اسٹینڈ میں رکھ کر چلا گیا۔

اِدھر اُس حسینہ کا بھائی پلدن ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچا تو دوستوں نے غلام کے ٹیکسی کی حالت پر اُس کی ملامت کی۔اور کہا۔

''کم از کم تمہیں ٹیکسی کو تو نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے تھا......غلام کی ہی مرمت کرتے تو کوئی بات ہوتی......''

''یارو غصے میں مجھے کچھ نہیں سوجھا......جو ہوا سو ہوا......اب وہ مجھے دھمکا کے چلا گیا ہے۔میں بھی ذرا دیکھتا ہوں......'' کہہ کر اُس نے بھی اپنی ٹیکسی اسٹینڈ میں کھڑی کر دی اور لیہہ کے بدنام چھنگ گلی کا رُخ کیا تا کہ خم ٹھونک کر سامنا کر سکے۔

یار دوست مناتے رہ گیے۔لیکن کسی کی ایک نہ چلی۔

کچھ دیر بعد ہی اُن کے تصادم کا چرچا گلی بازاروں میں عام ہو گیا۔آن کی آن میں بکھیڑا کھڑا ہوا۔ہنگامہ اتنا بڑھا کہ اکثریت اور اقلیت فرقہ کے طرف دار نوجوان سرکشی پر اُتر آئے۔ اِن لڑکوں کے ٹکراؤ میں شہر اور بیرون شہر کے بے خبر و بے قصور مرد و زن فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس گیے......دُکانیں دھڑا دھڑ بند ہو گئیں......موٹر گاڑیاں توڑ ڈالی گئیں......سوشل بائیکاٹ کا اعلان ہوا۔قصورواروں اور بے قصوروں کا امتیاز نہ رہا۔حالات تشویشناک ہو گیے۔

دونوں فرقہ کے دور اندیش رہنماؤں، مذہبی ہستیوں اور لیڈروں نے اس آگ کو بُجھانے کی جان توڑ کوشش کیں......لیکن مشتعل اور بے قابو نوجوانوں کے آگے ایک نہ چلی...... سرکاری مشینری بھی کمزور پڑ گئی......اکثریت کے نوجوان لڑکے ہاتھ دھو کر بے لگام گھوڑوں کی طرح اقلیتوں کے پیچھے پڑ گیے......خوب فتنہ ہوا......

فتنہ پرور چاہے مسلم تھا یا غیر مسلم۔ایک بد بخت، کم ظرف کی سزا سب کو ملنے لگی...... سوشل بائیکاٹ ہوا تو ہر طرف ہاہا کار مچی......کیوں نہ مچتی۔آخر اسی [80] فیصد مسلم اور غیر مسلم

خاندان کسی نہ کسی طرح آپسی رشتوں میں جو بندھے تھے اور مدتوں سے شادی بیاہ، دُکھ سُکھ، عید اور لوسر کے موقعوں پر ایک دوسروں کے پاس آجا کر آپسی دیرینہ رشتوں کی یادیں تازہ جو کرتے رہتے تھے۔

ایک بدمزاج سر پھرے کی وجہ سے سوشل بائیکاٹ کے کیا معنی......! کیا انسانیت نام کی چیز اب برائے نام رہ گئی ہے؟ کہاں گئی مذہبی رواداری......؟ کہاں گیا بھائی چارا و الالدا خ؟ سوچ کر میرا دماغ گھوم گیا۔

ہمارا گاؤں جہاں ہم تعینات تھے بھی اس آگ کی لپیٹ سے نہ بچ سکا۔ لیہہ شہر سے خلسے تک شاہراہ کے اغل بغل میں بسی آباد بستیوں کے چند شرارت پسند من چلوں نے اپنا احتجاج سڑکوں پر رواں دواں مال بردار اور مسافر گاڑیوں پر قہر برسا کر پورا کیا...... پتھراؤ اور مارا ماری میں لمبی مسافت کے جانے کتنے تھکے ماندے معصوم بے گناہ مرد و زن زخموں سے چور ہوئے۔ سول فورس کی کمی کے باوجود اعلیٰ منتظمان نے شہر اور اطراف سے مزید کمک پہنچنے تک حالات پر قابو پانے کی ہر ممکن جستجو کی...... بے شک قصوروار کو اُس کے کیئے کی سزا ملنی چاہیئے تھی، لیکن ایک بدبخت کے گناہوں کی سزا اتنے بے قصوروں کو دینا کہاں کا انصاف تھا۔ اکثریت طبقے کے اعتدال پسندوں نے بھی اس زیادتی پر افسوس کیا۔

میں اور اکرم دونوں ہی تیزی سے پھیلتی ہوئی نفرت کی آگ کی تپش بخوبی محسوس کرتے رہے۔ یہ آگ ہمارے دامن تک بھی آسکتی تھی۔ کیونکہ ہمارے گاؤں کی شاہراہ پر بھی مال بردار گاڑیوں کا بُرا حال کیا جا چکا تھا۔ کتنی ہی چمچماتی گاڑیاں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ کتنے ہی مسافر لہو لہان ہو چکے تھے...... بچے کھچے مسافر گھبرائے اور دم بخود تھے۔

یہ صرف چند گنے چنے سر پھرے مشتعل ہجوم کی کارستانیاں تھیں جو محض قومی شاہراہ پر جگہ جگہ ہڑبونگ اور دہشت مچاتے ہوئے اس گاؤں تک آن پہنچے تھے۔ اور اپنی رہنمائی میں گاؤں کے چند بھولے بھالے کم سن بچوں، لڑکوں اور نوجوانوں کو جوش دلا دلا کر اُکساتے اور بارود کی

طرح استعمال کر رہے تھے۔ گویا سارا ہجوم ان کے ماتحت تھا۔ ایک ذرا سے اشارے پر بناء سوچے سمجھے کسی بھی آنے والی گاڑی پر حملہ بول دیتے یا سنگسباری پر اُتر آتے تو ایک کہرام مچ جاتا...... حالانکہ کم زوروں کا دفاع کرنے کے لئے ادھیڑ عمر کے لوگوں اور سیّانے بزرگوں کی کمی نہ تھی۔ وہ ان کا دفاع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے تھے۔

اس توڑ پھوڑ اور ایذا رسانی میں رگزن سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ وہ تو اپنی شرارتوں کا بچپن سے ہی عادی تھا۔ لہٰذا اُسے بڑا مزہ آرہا تھا...... اُس کی شر پسندانہ حرکتوں سے میں بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

''کیا پتہ۔ کون جانے۔ شورش کی آڑ میں اُسے مجھ سے بدلہ لینے کا خیال آگیا تو کیا ہوگا؟'' سوچ کر ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ مجھے اُس کی ہر دم گھورتی ہوئی نگاہیں یاد آگئیں۔

دن کا وقت تھا۔ شور وغل اور کہرام کی صدائیں آس پاس کے پہاڑیوں میں گونجتی رہیں۔ ہم دونوں اپنے ڈیرے میں خاموش بُت بنے دہشت زدہ سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے...... میں کافی سہما ہوا تھا۔ بچاؤ کی ترکیب لازمی تھی لیکن کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔

میں نے طنز بھرے لہجے میں اکرم سے پوچھا۔

''کیوں اکرم...... تم تو ان لوگوں کی سادگی اور شرافت کے قصیدے کہتے تھکتے نہ تھے۔ پھر کہاں گئی آج وہ ساری باتیں......؟''

اکرم خود بھی حیران و پریشان تھا۔ اُس کی ڈوبی ہوئی کیفیت کا اندازہ اُس کے مایوس چہرے سے بہ آسانی لگایا جا سکتا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا بولا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔ ان لوگوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے...... جانے انجانے چہروں کو جولے (سلام) کہنے میں پہل کرنے والے، بلا لحاظ مذہب و ملت ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں بڑھ چڑھ کر پیش پیش رہنے والے اسی قوم کے لوگ تو ہوا کرتے تھے۔ دیسی پردیسی کے دُکھ درد کو سینے سے لگانے والے کوئی اور نہیں اسی خطے کے لوگ تو تھے۔ فرنگی سیاحوں کے آنے

سے پہلے تک تو یہ لوگ بالکل بھولے بھالے ہوا کرتے تھے...... جانے انہوں نے آکر کون سی پٹی پڑھا دی ہے۔ ورنہ ان کی سیاست تو ہر قسم کی اوچھے ہتھکنڈوں سے پاک ہوا کرتی تھی۔ جن دنوں یہاں سیاست بام عروج پر تھی۔ جن دنوں یہاں کے لوگ لیڈر اور منسٹر بن رہے تھے۔ اُن دنوں بھی کوئی ناخوش گوار واقعہ دیکھنے یا سُننے کو نہیں ملا تھا۔ جو کچھ کیا کندھوں سے کندھا ملا کر کیا۔ جو پایا مُل جُل کر پایا...... مذہبی رواداری کی لاج کبھی پامال نہ ہونے دی۔ معلوم نہیں آج ان کی سوچ میں یہ تبدیلی کہاں سے آگئی ہے...... مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا۔"

"بھئی کمال ہے......"

میں اُس کی باتوں سے جھنجھلا اُٹھا اور جلتے دل سے اُس پر چوٹ کرنے کی کوشش کی۔

"آنکھوں کے سامنے ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ گاڑیوں پہ گاڑیاں توڑی جارہی ہیں۔ بے قصوروں پر غیض وغضب کے پتھر برسائے جارہے ہیں اور تم ہو کہ یقین نہیں کی رٹ رٹے جا رہے ہو...... زمانہ بدل چُکا ہے میرے بھائی۔ انسان اور انسانیت کا گلا گھونٹنے میں جب دوسرے ترقی یافتہ ممالک بے جا ترقی کر سکتے ہیں تو یہ چھوٹا سا لداخ اور اس کے معصوم سے لوگ کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ اس دوڑ میں کیوں پیچھے رہیں......!"

"یہ بات نہیں۔ چند شر پسندوں کی وجہ سے سبھوں کو موردالزام ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بہت ملنسار اور اعتدال پسند ہیں۔ یہ خرافات تو چند گنے چُنے سر پھروں کی کارستانیاں ہونگی۔" ایسے لوگ کیا ہماری وادی میں موجود نہیں......؟"

پھر اکرم خود ہی جواب دیتا ہوا بولا۔

"...... ہماری وادی تو کیا دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں......"

میں نے اُس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بات میں دم ہے۔ مگر یہ تو سوچو جب اس چھوٹے سے دیہات میں اس قدر کہرام ہے تو وہاں لیہہ شہر میں کیا ہو رہا ہوگا...... مجھے ڈر ہے کہ فرقہ پرستی کی آڑ میں کہیں ہم بھی

نشانہ نہ بن جائیں......" میں نے اندیشہ ظاہر کیا تو اکرم نفی میں سر ہلا کر ڈھارس بندھاتا ہوا بولا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا......ہمت نہ ہارو ہم بالکل محفوظ ہیں۔"

مگر میرے دل کو اس کی باتوں سے بھلا کب قرار آتا۔ میں تو رگزن سے خوفزدہ تھا۔ ابھی ہم خاموش ہوئے ہی تھے کہ ماسٹر غلام قادر بھاگا بھاگا آیا......وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ اُس کی سانسیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ وہ ہانپتے ہوئے بڑی تیزی سے بولا۔

"آپ نے کچھ سُنا......؟ لیہہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی ہے۔ وادی کے تاجر اور ملازم کام دھندے چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر رہے ہیں...... معلوم نہیں کس پل کیا ہو جائے۔ اور میں نے سُنا ہے کہ رگزن پرائے لڑکوں کو آپ کے خلاف اُکسا رہا ہے......ذرا ہوشیار رہنا"۔ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

گھبراہٹ کے مارے گویا ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ہم نے اندر سے کُنڈی چڑھا دی اور اپنے خدا کو یاد کرنے لگے۔

یہ ہمارے لئے پیغام سے زیادہ ایک بم تھا۔ جس کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ اسے پھٹنا ضرور تھا اور یہ قہر بن کر ہم دونوں پر عنقریب ہی پھوٹنے والا تھا۔ اس پیغام سے ہمارے بچے کھچے اوسان خطا ہو گئے۔ حالانکہ ہمیں پیغام کے ساتھ ہی بچاؤ کی ترکیبیں کرنا چاہیے تھیں...... غیر ارادی طور پر ذہن میں خیال آیا کہ بچنے کے لئے چھپا رہنا ہی بہتر ترکیب ہے...... اس خیال کا ذکر اکرم سے کیا۔ وہ مطمئن تو ہوا لیکن ہم دونوں خوب سوچ کر بھی چھپنے کی جگہ کا انتخاب نہ کر سکے۔

وقت دھیرے دھیرے بڑھتا رہا ہمارے دل کی دھڑکنیں رفتار پکڑتی رہیں ۔ابھی شام کے سوا پانچ ہی بجے ہونگے کہ کوئی دروازے پر دستک دینے لگا۔ ہم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"کون ہے......؟"

باہر سے آواز آئی۔

"ماسٹر جی......ہم ہوں......دروازہ کھولو جی۔"

''آ...آپ کون ہیں؟'' اکرم نے ہمت کر کے پوچھا۔

''ہم رگزن کا باپ ہوں جی۔آپ گھبراؤ مت جی......''

ہم دونوں ہی بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔میں نے اکرم کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اُس نے ذراسی تامل کے بعد دروازہ کھولنے کی اجازت دے دی۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ جھانک کر بولا۔

''ماسٹر جی ہم یہ بولنے آیا ہوں کہ آپ بالکل فکر نہیں کرنا۔ہم نے اپنا بچہ کا شیطانی کرتوت کے بارے میں کچھ سُنا ہے۔اسی لئے ہم یہاں آیا ہوں جی۔اگر وہ آپ کو ہاتھ لگایا تو قنچک سُم (تین دیوتا) کا قسم ہم اُس کو ٹکڑا ٹکڑا کر کے چیل کوا کو کھلاؤں گا......ہاں جی۔ہم آپ کا ساتھ ہوں۔ہم ہر جگہ سے آپ کو خیال رکھتا ہوں......اگر آپ یہاں بیٹھ کر ڈرتا ہوں تو ابھی ہمارا ساتھ ہمارا گھر میں چلو جی۔ہم وہاں آپ کا دیکھ بھال کروں گا......کھانا پینا کا کچھ فکر مت کرنا جی......''

رگزن کا باپ غصے سے تلملایا ہوا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ اگر رگزن ابھی ہی اس کے ہاتھ لگ گیا تو آناً فاناً میں اُس کی جان لے ڈالے گا...... مجھے اپنی جان کی فکر تو بہت تھی لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہماری وجہ سے باپ بیٹے میں خون خرابہ ہو جائے۔جو بھلے ہی گاؤں والوں کے لئے فخر کی بات کہلائے لیکن ہمیں سر اُٹھا کر باقی ماندہ ایام جینے کا موقع نہ دے۔یہ سوچ کر ہی میں اُس بھلے مانس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''اچولے (بھائی صاحب)۔آپ مہان ہیں۔آپ واقعی مہان ہیں۔ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے کوئی غلط قدم اُٹھا کر آپ کسی بڑے گناہ کا مرتکب ہوں۔اپنے بیٹے کے بارے میں ایسا سوچنے کے بجائے اُسے صرف نرمی سے سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ہو سکتا ہے وہ آپ کی بات مان لے۔''

''ماسٹر جی......ہم ابھی گونپہ جاتا ہوں لاما جی کے پاس۔وہ ضرور سمجھائے گا۔لاما جی

بہت نیک آدمی ہوں۔ اُس کا بات بھی نہیں مانے گا تو بھگوان قسم ہم اپنا بچہ کو کلہاڑی سے ٹکڑا کر کے کُتا لوگ کو ڈال دوں گا۔"

وہ ہمیں حیران و پریشان چھوڑ کر تیزی سے نکل گیا۔ میں نے پُھرتی سے دروازے کی کُنڈی چڑھا دی۔

ہمارے ڈیرے مین ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ لیکن رگزن کے باپ کے آنے سے بچاؤ کی ایک اُمید بندھ گئی۔

آسمان ابر آلودہ ہو چکا تھا۔

گرمیوں کے لمبے دن تھے۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ کالے بادلوں کے باوجود کافی اُجالا تھا۔ حالانکہ سورج بادلوں کی اوٹ میں سے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا تھا۔

اکرم فرش خاکی پر نگاہیں ٹکائے اَن گنت وسوسوں میں غوطہ زن تھا۔ کبھی خودی میں بڑ بڑاتا اور کبھی لمبی سرد آہ بھر کر بیٹھے ہی بیٹھے کھڑکیوں میں سے باہر آسمان کی وسعتوں کو دیکھتا اور کبھی طنز بھری نظروں سے مجھے گھورتا۔

مجھ سے رہا نہ گیا تو اُس سے بولا۔

"اکرم کوئی بات تو کر و یار۔"

"بات کرنے کے لئے بچا ہی کیا میرے دوست ......" اُس کے لہجے میں طنز اُبھری "اسکول کا ربط و ضبط اور بچوں کا تعلیمی معیار بلند کر کے تمہیں جو ایوارڈ ملنا چاہیے تھا وہ شاید......اب اس طرح ملنے والا ہے ان سرکش بچوں کے ہاتھوں جن کے بہتر مستقبل کی تم نے آرزو کی تھی ......اب بھگتو۔ تمہاری وجہ سے میری بھی جان کے لالے پڑ گئے ہیں ......ارے کس نے کہا تھا اتنا کٹھور بننے کے لئے۔ یار وسیم ......اتنے سارے اسٹاف ممبران مر گئے تھے کیا جو تم نے بیڑا پار لگانے کا ٹھیکہ لے کر سبھوں سے دشمنی مول لی۔ کیا دوسرے اساتذہ بچوں کو سدھارنے کا ٹھیکہ نہیں لے سکتے تھے......؟ ارے دو سال کا عرصہ ہی تو گزارنا تھا۔ اپنے

فرائض انجام دینے کے لئے اوروں کی طرح سرسری پڑھا کر سوال جواب پوچھنے اور سُننے سے پرہیز کرتے۔ تو آج یہ نوبت نہ آتی...... بچے بھی ہم سے راضی رہتے......"

اکرم کی باتوں سے میرے دل کو چوٹ پہنچی...... وہ گھبراہٹ میں نہ جانے کیا کیا کہے جارہا تھا۔ میں نے حلیمی سے جواب دیا۔

"لیکن اکرم میں نے تو وہی کیا جو میں ہر جگہ کرتا آیا ہوں۔ میں نے درس وتدریس کے معاملے میں کبھی جانب داری سے کام نہیں لیا نہ کبھی امیر، غریب، شریف، شریر، ذات اور مذہب کسی چیز کا فرق کیا۔ سبھوں کو کو ایک سا پڑھایا۔ ایک ہی لاٹھی سے ہانکا...... ایک جیسا بنانے کی کوشش کی۔"

اُس نے مجھے ٹوک دیا۔ کہا۔

"مگر وسیم...... یہ پردیس ہے۔ ہم یہاں ہر صورت میں محتاج ہیں۔ ہمارے جذبات، ہمارے احساسات سمجھنے اور پرکھنے والا یہاں کوئی نہیں"

"مجھے تمہاری باتوں سے اتفاق نہیں۔ سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے اکرم۔ رگزن کے باپ کی مثال تمہارے سامنے ہے......" یہ کہہ کر میں خاموش ہوا تو اکرم بولا۔

"کیا کر سکے گا وہ......؟ ایک رگزن کو سنبھالا تو کیا وہ سارے سرکش لڑکے سنبھل پائیں گے جنہیں رگزن نے اُکسایا ہوگا...... ایک اکیلے کی بات اور ہے۔ اور ہجوم کی بات اور...... اب تو خدا ہی بچائے۔"

یکا یک باہر کچھ بھاگم بھاگ شروع ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے دوڑ کر کھڑکی کے پاس آکر ایک ساتھ چلاّئے۔

"ماسٹر جی بھاگ جاؤ...... بھاگ جاؤ...... جلدی بھاگ جاؤ ماسٹر جی...... دروازہ کھولو......"

میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"کیا ہوا بچّو...... کیا ہوا...... جلدی بتاؤ۔"

سارے بچے گھبرا کر ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے لگے۔

"وہ لوگ مار ڈالیں گے......آپ لوگ جلدی بھاگ جاؤ......اُن کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے......بیلچہ بھی ہے......بہت لڑکا لوگ جلوس بن کر اِدھر آتا ہے۔ آپ جلدی بھاگ جاؤ۔ وہ مار ڈالے گا۔ رگزن کے ہاتھ میں بھی کلہاڑی ہے......وہی سب کو لاتا ہے......آپ جلدی بھاگ جاؤ ماسٹر جی۔"

یہ سُنتے ہی ہمارے پیروں تلے سے گویا زمین سرک گئی......ٹانگیں تھرتھرانے لگیں......بچّے بھاگنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ اور ہماری ٹانگوں کی سکّت جواب دینے لگی تھی......سمجھ میں نہیں آیا کہاں کو بھاگیں۔

"ماسٹر جی......جلدی کرو......دروازہ کھولو......جلدی بھاگو......"

بچے ہمیں بچانے کے لئے تڑپ رہے تھے۔

"لیکن بچّو! ہم کہاں بھاگیں۔؟"

"ماسٹر جی......وہاں اوپر بھاگو......" ایک بچے نے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا......"اُس پہاڑی پر بھاگو......جلدی کرو......وہاں جا کر چھپ جاؤ......جلدی کرو......وہ آجائیں گے......" کچھ بچے تو کہتے کہتے روہانسے بھی ہو گئے۔

ہم نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اور ندی کے ساتھ والی پگڈنڈی پر اندھا دھند بالائی علاقے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اب رگزن اور اُس کے بہت سارے اجنبی ساتھی جنہیں ہمارے بھاگنے کی بھنک لگ چکی تھی غوغا کرتے ہوئے ہمارے تعاقب میں دوڑ پڑے۔

اِدھر اِس کہرام میں گھنگھور گھٹاؤں نے گاؤں کو گھیر کر چنگھاڑنا شروع کیا۔ کالے بادلوں میں گرج چمک کے ساتھ بجلی کی لپکیں دوڑنے لگیں۔ لمحہ بہ لمحہ آنے والی بربادی کا دھڑکا بڑھنے لگا......

باب اُنیسواں

رگزن کا والد گومپہ پہنچ کر چھوٹے لاما جی سے ملا۔ اُسے رگزن کی ساری روداد سُنا دی۔ لاما جی ساری باتیں سُنتے ہی اچنبھے میں پڑ کر پیچ وتاب کھانے لگے...... بات کافی بڑھ چکی تھی۔ تدارُک کا موقع بھی کم رہ گیا تھا۔ لیکن کوشش کرنا بھی تو ضروری تھا۔ اس لئے دونوں ہی تیزی سے بڑے لامہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک تنگ کوٹھری نما کمرہ تھا۔ روشن دان چھوٹے ہونے کی وجہ سے کمرے میں نیم مدہم سی روشنی تھی۔

رگزن کا باپ دنوں ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ اور چھوٹے لاما جی نے ساری داستان ایک پل میں بڑے لاما جی کو سُنا ڈالی۔ بڑے لاما جی بھی پریشان ہو اُٹھے...... بولے۔

''گھور پاپ ہونے جارہا ہے...... اسے روکنا ہوگا...... اسے روکنا ہوگا...... ورنہ دیوی دیوتا ناراض ہوجائیں گے...... لال چونچ والے پرندے زندہ نہ رہ پائیں گے۔ سیاہ وسفید دورنگی پرندے ٹھکانہ بدل دیں گے۔ تیتر خرگوش پہاڑی بکرے سب بھاگ جائیں گے...... اگر ایسا ہوا تو کیڑے مکوڑوں کی بھرمار ہوگی...... زمین اناج دینا بند کردے گی...... پیڑ پودے پھل دینا چھوڑ دیں گے۔ ہر طرف اکال ہوگا بھوک مری ہوگی۔ وبا پھوٹ پڑے گی...... گاؤں کی خوشیاں روٹھ جائیں گی کسی کے گھر میں شادی نہ ہوگی بُری آتمائیں بھٹکنا شروع کردیں گی۔ بادل پھٹ پڑے گا...... ہر طرف ہر دم موت منڈلائے گی۔ اُسے روکنا ہوگا۔ اُسے احساس دلانا ہوگا......

سارے بچے گھبرا کر ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے لگے۔

"وہ لوگ مار ڈالیں گے......آپ لوگ جلدی بھاگ جاؤ......اُن کے ہاتھ میں ڈنڈا بیلچہ بھی ہے......بہت لڑکا لوگ جلوس بن کر اِدھر آتا ہے۔آپ جلدی بھاگ جاؤ۔وہ مار ڈا گا۔رگزن کے ہاتھ میں بھی کلہاڑی ہے......وہی سب کو لاتا ہے......آپ جلدی بھا جاؤ ماسٹر جی۔"

یہ سُنتے ہی ہمارے پیروں تلے سے گویا زمین سرک گئی......ٹانگیں تھرتھرانے لگیں... بچّے بھاگنے کے لئے کہہ رہے تھے۔اور ہماری ٹانگوں کی سکّت جواب دینے لگی تھی......سمجھ میں نہیں آیا کہاں کو بھاگیں۔

"ماسٹر جی......جلدی کرو......دروازہ کھولو......جلدی بھاگو......"

بچے ہمیں بچانے کے لئے تڑپ رہے تھے۔

"لیکن بچّو! ہم کہاں بھاگیں۔؟"

"ماسٹر جی......وہاں اوپر بھاگو......" ایک بچے نے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا......"اُس پہاڑی پر بھاگو......جلدی کرو......وہاں جا کر چھُپ جاؤ......جلدی کرو......وہ آجائیں گے......" کچھ بچے تو کہتے کہتے روہانسے بھی ہو گئے۔

ہم نے جلدی سے دروازہ کھولا۔اور ندی کے ساتھ والی پگڈنڈی پر اندھا دھند بالائی علاقے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اب رگزن اور اُس کے بہت سارے اجنبی ساتھی جنہیں ہمارے بھاگنے کی بھنک لگ چکی تھی غوغا کرتے ہوئے ہمارے تعاقب میں دوڑ پڑے۔

اِدھر اس کہرام میں گھنگھور گھٹاؤں نے گاؤں کو گھیر کر چنگھاڑنا شروع کیا۔کالے بادلوں میں گرج چمک کے ساتھ بجلی کی لپکیں دوڑنے لگیں۔لمحہ بہ لمحہ آنے والی بربادی کا دھڑکا بڑھنے لگا......

بچے اُسے صاف نظر آنے لگے۔ ہمارے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان اب بھی کافی فاصلہ تھا۔ لیکن بار بار گرنے اور سنگریزوں پر پھسلنے سے ہماری چال اور ہمت جواب دینے لگی تھی۔ ہماری دفاع میں دوڑنے والے تو اور بھی پیچھے رہ گئے۔ بالائی علاقے کی طرف بھاگتے ہوئے اب ہم ٹیلے کے پاس پہنچنے والے تھے......

ٹیلے کے دامن تک پہنچتے پہنچتے بُرا حال ہوا۔ ٹیلے کے بعد آگے ڈھلوان پہاڑی کی چڑھائی تھی۔ خدا جانے آگے اور کیا حال ہوتا......؟ چڑھائی چڑھ بھی پاتے یا نہیں......سانس بھی پھولی جارہی تھی ......جان بچنے کے لئے کوئی چمتکار کوئی معجزہ ہو تو ہو۔ ورنہ پہاڑ کی بلندی بھی جان بچانے میں مددگار ثابت نہ ہوتی۔

تعاقب جاری تھا۔ دفاع پر کوشاں مردوزن سے مدد کی امید نا کے برابر تھی۔ اس لیے کہ وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود پیچھے رہ گئے تھے۔

ہم ہانپتے کانپتے گرتے سنبھلتے بھاگتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے درندے شکار پر جھپٹنے کے لئے پیچھا کر رہے ہوں۔ بہت دہشت ناک منظر تھا معماروں کی بُری درگت ہونے جارہی تھی۔

اُدھر رگزن کے باپ پر بھی بیٹے کا خون سوار تھا۔ وہ بھی دیوانہ وار دوڑ رہا اور دوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا......

"میں تجھے مار ڈالوں گا رگزن ......میں تجھے مار ڈالوں گا۔"

لیکن رگزن اپنے باپ کے خطرناک ارادوں سے بے خبر کلہاڑی اُٹھائے تعاقب میں سب سے آگے دوڑتا رہا۔

اب ہم دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے چوپائیوں کی طرح بہ مشکل تمام ٹیلے پر پہنچ گئے۔ اس سے آگے بھاگنے کی ہمت نہ رہی۔

ہم نے ایک نظر تعاقب میں آنے والوں پر ڈالی تو یوں لگا کہ رگزن سب سے آگے

ہے پرمیشور...... ہے دیوی دیوتاؤ ہمیں اور ہمارے گاؤں کو بُری آتماؤں سے بچاؤ"

سامنے ہی پوجا استھان پر بھگوان گوتم بُدھ کی چھوٹی سی مورتی کے سامنے ایک متبرک چراغ روشن تھا...... بڑے لاما جی نے چھوٹے لاما جی کو اشارے سے پاس بٹھالیا اور بُرے آسیبوں کو بھگانے کے لئے اونچی آوازوں میں منتروں کی جاپ کرتے ہوئے گوندھے آٹے کے ستو کی چھوٹی چھوٹی عجیب وغریب شکلیں بنانا شروع کیں۔

رگزن کا باپ متانت سے ہاتھ جوڑے ان کی طرف متوجہ تھا۔اُسے اگلے پل کی فکر ستائے جارہی تھی۔ تبھی چھوٹے لاما جی نے مُڑ کر مخصوص انداز میں اُسے فوراً جانے کا اشارہ کیا.....وہ سمجھ گیا کہ لامہ جی دونوں ماسٹروں کے سامنے جلد سے جلد اُس کی موجودگی چاہتے ہیں تاکہ اُن کا دفاع بھی ممکن ہوسکے۔

وہ جولے (سلام) کہہ کر فوراً ہی پلٹا اور تیزی سے گونپے کی لمبی سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچا...... اُس نے دیکھا کچھ لڑکے چلّاتے ہوئے اسکی جانب دوڑے چلے آرہے ہیں۔ قریب آکر وہ سب رُک گئے اور ہانپتی کانپتی آواز میں لداخی بولی میں مخاطب ہوئے۔

"ابالے۔اُن دونوں کو بچالیجئے۔وہ اُنہیں مار ڈالیں گے۔آپ کا بیٹا چند اجنبیوں کو لے کر انہیں مارنے گیا ہے۔اُس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی بھی ہے۔ نمگیل، مورپ، ژھے تن اور ٹشی بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔کچھ کیجئے ابالے...... ہمارے ماسٹر جی کو بچالیجئے۔وہ دونوں اُس پہاڑی کی طرف بھاگے ہیں۔"

یہ سُنتے ہی ابالے کے چہرے پر کئی رنگ آکر چلے گئے۔غصے میں چہرہ تمتما اُٹھا۔اُس نے وہیں سے ایک مکان کی طرف دوڑ لگائی۔اندر گھس کر اِدھر اُدھر ڈھونڈا تو ایک پھاوڑا ہاتھ لگا۔یہی لے کر وہ نزدیکی رستوں سے اُدھر کی طرف دوڑا جدھر ہم بھاگے چلے جارہے تھے۔اور جہاں اجنبی بلوائی ہمارے تعاقب میں لگے تھے۔جوں جوں رگزن کا باپ بلوائیوں کے قریب ہوتا گیا ہجوم کی آوازیں قریب ہوتی گئیں۔یہاں تک کہ ہم دونوں، ہمارا تعاقب کرنے والے بلوائی اور ہماری دفاع میں کوشاں مرد وزن اور

بچے اُسے صاف نظر آنے لگے۔ ہمارے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان اب بھی کافی فاصلہ تھا۔ لیکن بار بار گرنے اور سنگریزوں پر پھسلنے سے ہماری چال اور ہمت جواب دینے لگی تھی۔ ہماری دفاع میں دوڑنے والے تو اور بھی پیچھے رہ گئے۔ بالائی علاقے کی طرف بھاگتے ہوئے اب ہم ٹیلے کے پاس پہنچنے والے تھے......

ٹیلے کے دامن تک پہنچتے پہنچتے بُرا حال ہوا۔ ٹیلے کے بعد آگے ڈھلوان پہاڑی کی چڑھائی تھی۔ خدا جانے آگے اور کیا حال ہوتا......؟ چڑھائی چڑھ بھی پاتے یا نہیں......سانس بھی پھولی جارہی تھی......جان بچنے کے لئے کوئی چمتکار کوئی معجزہ ہوتو ہو۔ ورنہ پہاڑ کی بلندی بھی جان بچانے میں مددگار ثابت نہ ہوتی۔

تعاقب جاری تھا۔ دفاع پر کوشاں مرد وزن سے مدد کی امید نا کے برابر تھی۔ اسلئے کہ وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود پیچھے رہ گئے تھے۔

ہم ہانپتے کانپتے گرتے سنبھلتے بھاگتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سارے شکاری درندے شکار پر جھپٹنے کے لئے پیچھا کر رہے ہوں۔ بہت دہشت ناک منظر تھا......قوم کے معماروں کی بُری درگت ہونے جارہی تھی۔

اُدھر رَگزن کے باپ پر بھی بیٹے کا خون سوار تھا۔ وہ بھی دیوانہ وار دوڑا چلا آرہا تھا اور دوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا......

''میں تجھے مار ڈالوں گا رگزن......میں تجھے مار ڈالوں گا۔''

لیکن رگزن اپنے باپ کے خطرناک ارادوں سے بے خبر کلہاڑی اُٹھائے ہمارے تعاقب میں سب سے آگے دوڑتا رہا۔

اب ہم دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے چوپائیوں کی طرح بہ مشکل تمام ٹیلے پر چڑھ گئے۔ اس سے آگے بھاگنے کی ہمت نہ رہی۔

ہم نے ایک نظر تعاقب میں آنے والوں پر ڈالی تو یوں لگا کہ رگزن سب سے آگے

کلہاڑی بلند کئے ہمارے قریب ٹیلے پر چڑھ آیا ہے......اُسے دیکھ کر میں کٹی شاخ کی طرح گر پڑا......میرے منہ سے منّت سماجت بھی نہ نکلی......میں بہت گھبرایا ہوا تھا......

مجھے گرتے دیکھ کر وہ میری طرف لپکا اور خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے وار کرنے کیلئے کلہاڑی کو فضا میں بلند کیا......میں مرغ بسمل کی طرح سمٹ گیا۔ میں نے سر پر وار روکنے کے لئے دونوں ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف اُٹھالیا۔ کلہاڑی چند لمحے کے لئے اُس کے بلند ہاتھوں میں معلق رہ گیا۔ میرا سر اُس کی کلہاڑی کے ٹھیک نشانے پر تھا۔ بس ایک ہی وار میں میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے والی تھی۔ تعاقب کرنے والے بلوائیوں کی ٹولی بھی ٹیلے پر پہنچ چکی تھی۔

جانے کیا ہوا......شاید اس کی چھٹی حِس بیدار ہوگئی......یا اُس کے اندر کا انسان جاگا......یا پھر شاید ضمیر تڑپ اُٹھا تھا کہ اُس نے ایک نظر آسمانوں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرلی اور بڑبڑایا۔

"ہے بھگوان......یہ میں کیا پاپ کرنے جارہا تھا مجھے کیا ہوگیا بھگوان۔ مجھ پاپی کو معاف کرنا بھگوان مجھے معاف کرنا......"

یہ چمتکار نہیں تھا تو کیا تھا کہ رگزن اچانک ہوا میں بلند کلہاڑی کے ساتھ بلوائیوں کی ٹولی کی طرف پلٹا اور للکار اُٹھا......

"خبردار جو کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو۔ سب کو کاٹ کے رکھ دوں گا۔"

سارے بلوائی جسے وہ خود ہی اُکسالایا تھا دم بہ خود رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ یکا یک یہ رگزن کو کیا ہوگیا ہے......اس نے تو ساری کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ اس دوران نمگیل، مورپ، ژھےتن اور ٹشی کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔

ہم دونوں بھی اس کی اچانک تبدیلی پر حیران ہوئے۔ ہماری جان کا دشمن ہمارا دفاع کرنے پر تل گیا تھا۔

وہ گرجدار آواز میں مُسلسل چلانے لگا۔

''کوئی بھی آگے مت بڑھنا ورنہ ایک ایک کو چیر کے رکھ دوں گا۔ایک ایک کا خون پی جاؤں گا...... چلے جاؤ۔ میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ......''

کہتے کہتے اُس کی آواز بھاری ہوگئی۔آنکھیں ندامت اور جذبات کی آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔پھر وہ کلہاڑی کو ایک طرف پٹخ کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھک کر میرے مقابل دوزانو ہو گیا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر زاروقطار رونے لگا۔

رگزن کا باپ جو قریب پہنچ چکا تھا۔اُس اچانک تبدیلی پر حیران ہو کر کبھی رگزن کبھی بلوائیوں کی ہڑ بڑائی ٹولی کو اور کبھی ہمیں دیکھنے لگا۔

بیٹے کی اچانک تبدیلی اُس کے لئے باعث فرحت تھی۔اُس کا جی چاہا کہ لپک کر بیٹے کو سینے سے لگا لے۔اُس پر ساری محبت نچھاور کر دے۔مگر دل کے کسی کونے میں غصے کی کوئی چنگاری اب بھی سلگ رہی تھی۔جو پیار نچھاور کرنے سے روکتی رہی......البتہ اُس نے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں پھیر دیں۔''

رگزن نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا تو باپ کو سامنے پا کر اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔باپ نے شانے تھپتھپاتے ہوئے بھرآئی آواز میں کہا۔

''مورکھ، پاپی۔بڑھ کر ماسٹر جی کے پیر پکڑ لے......معافی مانگ لے ان سے......''

''ابا لے...... میں معافی کے لائق نہیں ہوں...... میں نے گھور پاپ کیا ہے...... میں ان کے قدموں میں گرنے کے لائق نہیں ہوں......''

وہ بار ہا ان جملوں کو دہراتا ہوا گھِسٹ گھِسٹ کر میرے قدموں تک پہنچا اور جوتوں پر سر رکھ کر زاروقطار روتے ہوئے دہراتا گیا۔

''میں معافی کے لائق نہیں ہوں...... میں نے گھور پاپ کیا ہے...... میں قصوروار ہوں، پاپی ہوں...... مجھے سزا دیجئے......''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں نفرت سے اپنے پیر جھٹک دوں یا اُسے معاف کر دوں......

البتہ مجھے لگا کہ آج سچ مچ میری جان توڑ محنت رنگ لے آئی ہے۔ آج سچ مچ بچّوں کا احساس جاگا تھا کیونکہ سارے شر پسند بچے معافی مانگنے کے لئے ہاتھ جوڑے گھٹنے ٹیکے ہمارے سامنے ندامت سے سر جھکائے بیٹھے زاروقطار رو رہے تھے۔

نمبردار کے ہمراہ ہمیں بچانے کے لئے گاؤں کا گاؤں ٹیلے پر چڑھ آیا تھا۔ اُن میں ماسٹر دورجے اور اسکول کے دوسرے غیر مسلم اساتذہ بھی موجود تھے۔ وہ بھی بدلا بدلا منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اُدھر چھورول بھی ایک بڑی سی لاٹھی اُٹھائے بپھری شیرنی کی طرح گرتی پڑتی چڑھائی چڑھ کر ٹیلے پر میرے قریب پہنچ گئی اور سارا معاملہ شانت دیکھنے کے باوجود میرے قدموں میں پڑے رگزن کے سر پر بدحواسی میں چیختی ہوئی بے تحاشہ وار کر بیٹھی۔

"کم بخت...... میرے دیوتا جیسے بھائی پر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی......"

وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے بھی اُسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ رگزن کا باپ بھی دیکھتا ہی رہ گیا۔

سر پر چوٹ لگتے ہی رگزن لڑھک کر ایک طرف جا گرا۔ اُس کے ماتھے سے خون کا فوار بہہ نکلا۔ وہ سر کے زخم پر ہاتھ رکھے چھورول کی طرف دیکھ کر ندامت سے بولا۔

"میں اسی لائق ہوں چھورول۔ میں اسی لایق ہوں...... میرے لئے یہ بھی کم ہے۔"

چھورول حواس باختہ تھی۔ رگزن میں اچانک بدلاؤ دیکھ کر پہلے تو اُسے یقین نہ آیا۔ پھر جب سنبھلی تو ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ کر دور جا گرا۔ وہ شرما کر رگزن کے باپ وانگیل کی طرف دیکھنے لگی۔ وانگیل نے مسکرا کر متجسس نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لیا تو بڑے اور چھوٹے لاما جی کو اپنی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پایا۔ پھر اُس نے آسمانوں میں اُن دیوی دیوتاؤں کو متلاشی نگاہوں سے ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی جنہوں نے گاؤں کی خوشیاں لوٹا دی تھیں جنہوں نے اَکال، بھک مری اور بُری آتماؤں کو کوسوں دور بھگا دیا تھا۔

چھورول نے سچ مچ میں بہن ہونے کا حق ادا کر کے ہمارے زخمی دلوں پر پھاہا رکھنے کا وہ حق ادا کر دیا تھا جو ایسے حالات میں بالکل بھی ممکن نہ تھا۔

میرے دل کو کافی ٹھنڈک ملی......اکرم بھی مطمئن نظر آیا۔ ہماری حالت زار پر گاؤں والوں کی آنکھیں پُر نم تھیں لیکن آکاش کے گھنگور بادل چھٹ چکے تھے۔ مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔

میں نے دھیرے سے اکرم کے کان میں کہا۔

"دیکھا اکرم......دماغ مر سکتا ہے لیکن......! ضمیر کبھی نہیں مرتا۔"

اچانک میں چونک پڑا...... مجھے یاد آیا کہ میں اسکول سے نکل کر پولیس چوکی کی طرف جا رہا ہوں۔ چھورول میرے پیچھے تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ پچھلے سارے مناظر ڈراؤنے سپنے کی طرح ذہن کی سطح پہ اُبھر کر میرے ضمیر پر کچوکے لگا چکے تھے۔ تناؤ اور غصے کی وجہ سے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں۔ قصوروار لڑکوں کو سزا دلوانے کے خیال سے میرا روم روم بدلے کی تپش میں سُلگ رہا۔ چوکی پہنچتے پہنچتے میں خیالوں کی دنیا سے واپس آیا تو ہوش ٹھکانے آ گئے......

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد ہم پولیس چوکی جا پہنچے۔ وہاں چوکی آفیسر اور تھانیدار بلکہ نئی کمک کے بہت سارے سپاہی موجود تھے۔ میں گڈ آفٹر نون Good After Noon کہہ کر اندر داخل ہو گیا۔ چھورول بھی میرے پیچھے چلی آئی۔ تھانیدار نے کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے بیٹھتے ہوئے خود کو متعارف کروایا۔

"میرا نام وسیم ہے۔ میں مقامی ہائی اسکول میں ماسٹر ہوں۔"

نام سُن کر وہ چونک پڑے۔

"اچھا تو آپ ہیں وہ جن کا تذکرہ تھا......کوئی بات نہیں سر۔ ہم ان بدمعاشوں کو آٹے دال کا بھاؤ بتا دیں گے......آیئے دیکھ لیجئے......یہی ہیں وہ سر پھرے......؟"

وہ مجھے کوٹھری کے قریب لے گیا۔

کوٹھری کی آہنی سلاخوں کے پیچھے رگزن گھٹنوں پر سر رکھے دوستوں سے بالکل الگ تھلگ دیوار سے ٹیک لگائے سمٹا بیٹھا تھا۔

اُنہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد میں نے نفرت سے منہ پھیر لی۔ بکھرے بال اور بگڑے حلیئے سے اُس کی پشیمانی صاف جھلک رہی تھی۔ اُسے نہ صرف اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا بلکہ پرائسچت کے لئے ہر قسم کی سزا بھگتنے کو بھی تیار تھا۔ دوسرے تین دوست بھی پشیمانی کی حالت میں ایک کونے میں سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے۔ شاید سبھوں کی تھوڑی بہت مرمت بھی ہو چکی تھی۔

مجھے دیکھ کر تینوں اور بھی سمٹ گئے۔

"کچھ ہی دیر میں ہم انہیں ڈسٹرکٹ جیل روانہ کرنے والے ہیں......"

تھانیدار مجھ سے مخاطب ہوا۔

"وہاں جب تھرڈ ڈگری کا استعمال ہوگا تب خود جان جائیں گے کہ سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے......لیکن چونکہ ہم واردات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اس لئے اگر آپ تفصیل سے روشنی ڈالیں تو سٹرانگ کیس Strong Case بنانے میں آسانی ہوگی۔"

اُس کے خاموش ہوتے ہی یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا کہ معاملہ واقعی سنگین ہے اور کیس Case بنانے کی صورت میں چاروں کی زندگی تباہ ہو سکتی ہے۔ بالخصوص رگزن کا کیرئیر Career برباد ہو سکتا ہے اور میرا بدلہ بھی پورا ہو سکتا ہے۔

لیکن......

کیا اُستاد کی حیثیت سے بدلہ لینا میرا کام تھا......؟

کیا قصورواروں سے بدلہ لینا معمار قوم کا شیوہ ہو سکتا ہے......؟

ضمیر اور شعور نے کئی چبھتے سوالات اُبھار کر میری ملامت کر دی......

چھوروَل میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ میں نے اُسے اپنی خاموشی پر حیران ہوتے دیکھ کر رائے جاننے کی کوشش کی۔

"تم کیا کہتی ہو اس بارے میں......؟

"ماسٹر جی۔ آپ کے دل میں دیا جاگی ہے شاید۔ مگر انہیں معاف کبھی نہ کیجئے۔"

میں اُس کی بات پر مسکرا دیا۔ اور کوٹھری کی سلاخوں سے چاروں قصوروار لڑکوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے تھانیدار سے بولا۔

"جناب میرا تجربہ ہے۔ یہ لڑکے لوہے کی طرح پچھتاوے کی بھٹی میں تپ کر موڑنے مروڑنے کے لائق ہو چکے ہیں۔ اب ان کی جو بھی صورتیں بنائی جائے بن جائے گی۔ ابھی ان کے آگے ساری زندگی دھری پڑی ہے...... مجھے ان کے کیریئر Career بگاڑنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ سب ہماری قوم کی امانت ہیں۔ انہیں اور بے قدر کرنا ٹھیک نہیں۔"

"یہ آپ کیا کہتے ہیں سر جی۔ جنہوں نے آپ کی بے قدری کی آپ اُن کے ہی قدر کی بات کرتے ہیں...... ایسے ردی لڑکوں کے ساتھ ہمدردی جتا رہے ہیں آپ......؟"

"میں جانتا ہوں جناب...... یہ سارے کڑی سزا کے حقدار ہیں......لیکن ایسا کر کے ہم انہیں جرموں کی طرف دھکیل کر ڈھیٹ اور ضدی بنائے رکھنے کے مرتکب ہونگے......آپ قانون کے رکھوالے کی حیثیت سے بات کرتے ہیں...... میں معمار قوم کی حیثیت سے سوچتا ہوں۔ میرے نظریئے میں ان کی رہائی اس گاؤں کے روشن مستقبل کی ضمانت ہوگی......ان کا ضمیر بیدار ہو چکا ہے...... مجھے یقین ہے کہ کھلی فضا میں جانے کے بعد یہ لوگ سماج اور قوم کا مزاج بدل کر رکھ دیں گے۔"

تینوں لڑکے بیچارگی اور اُمید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ جبکہ رگزن ندامت سے سر جھکائے کوٹھری کے قریب آ کر روتے ہوئے بولا۔

"تھانیدار صاحب مجھے بڑی سے بڑی سزا دلوا دیجئے۔ میں قصوروار ہوں، پاپی ہوں۔ مجرم ہوں...... مجھے سزا دلوا دیجئے...... مجھے یہاں سے نہ نکالئے۔ میں رہا ہونا نہیں چاہتا......"

رگزن کے رو رو کر اصرار کرنے پر چھورول کافی متاثر ہوئی۔ اُسے لگا کہ میں نے تینوں

لڑکوں، اور رگزن کی وکالت میں تھانیدار صاحب سے مناسب اور موزوں گفتگو کی ہے......

رگزن کے بدلاؤ پر چھورول کا من پسیجا اور اُس پر نچھاور ہونے کو چاہا۔

میں نے چھورول کے من کی کیفیت بھانپ لی...... یہ وہی تیز وطرار لڑکی تھی جس نے رگزن کے سر پر لاٹھی مار کر میری بہنا ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرادی تو میں نے تھانیدار سے مخاطب ہو کر عرض کی۔

"تھانیدار صاحب آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ ان سبھوں کو رہا کر دیں......ان کی سزا یہی ہے کہ یہ گاؤں والوں اور اپنے پرائیوں کی نفرتیں سہنے کے باوجود زندگی میں کچھ ایسا اچھا کر دکھائیں کہ گاؤں والوں اور اساتذہ کے دلوں سے کڑواہٹوں کے سارے داغ مٹ سکے......"

تھانیدار صاحب مجھ سے کافی متاثر ہوئے۔ اُس نے سپاہی سے جھٹ پٹ کوٹھری کا تالا کھول کر انہیں رہا کرنے کا حکم دیا۔

تالا کھلتے ہی تینوں لڑکے شرماتے ہوئے باہر آئے اور میرے پاؤں کی دھول اپنے ماتھے پر لگا کر "جولے سرجی" کہتے ہوئے نکل گئے۔ رگزن کوٹھری سے نہ نکلا تو چھورول میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔

"جاؤ......ہاتھ پکڑ کر نکال لاؤ......"

وہ "جی بھیاء" کہہ کر جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ میں نے روک کر دھیرے سے کہا۔

"اب زندگی میں جو کوئی بھی اس کا ہاتھ پکڑے گی سکھی رہے گی......"

وہ شرما کر کچھ نہ بولی۔ میں اُسے وہیں چھوڑ کر تھانیدار سے رخصت لینے کے بعد تیزی سے نکل گیا......

میرا دل اب بھی بوجھل تھا......

(ختم شد)

Urdu Novel

"Ahsas"

By: Abdul Rashid Rahgeer Ladkhi

ریاستی اردو ادبی دنیا میں عبدالرشید راہگیر لداخی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ایک عرصہ سے وہ [illegible] پیشے سے منسلک رہے اور کم و بیش دُور دراز علاقوں میں تعیناتی کے دوران اپنا ادبی سفر جاری [illegible] ہے کہ انہیں صحافت سے دِلی لگاؤ اور گہرا شغف رہا۔ انہوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی [illegible] تک طبیعت کو راس نہ آئی۔ پھر اچانک فکشن نِگاری میں دلچسپی پیدا ہوئی اور کئی کہانیاں لکھنے کے [illegible] ''احساس'' قلمبند کیا۔

راہگیر صاحب لیہہ لداخ سے تعلق رکھتے ہیں جو سردیوں کے لگ بھگ پانچ چھ ماہ تک باقی [illegible] ہے۔ لداخ ریاست کا سب سے دُور افتادہ اور پسماندہ خطہ رہا ہے۔ عبدالرشید راہگیر کا یہیں جنم ہوا، [illegible] لداخ کے ننگے پہاڑوں تاہم خوبصورت قدرتی مناظر والے اِس خطے میں اِنکا ادبی ذوق بیدار ہوا۔

عبدالرشید راہگیر کو اعلیٰ خدمات کے پیش نظر سال 2007ء میں ریاستی سطح پر بہترین استاد کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ جناب غلام نبی آزاد نے یہ اعزاز ایک لاکھ روپے کی چک اور توصیفی سند کی صورت میں بذاتِ خود مرحمت فرمایا۔

''احساس'' ناول اِن کی اوّلین کاوش ہے جس میں لداخی زندگی کے مختلف پہلو جھلکتے ہیں۔ جنہیں عبدالرشید راہگیر نے لداخ کے جغرافیائی، معاشرتی اور روایتی پسِ منظر میں خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔

ہر تخلیق کے پسِ پُشت تخلیق کار بالواسطہ یا براہِ راست نظر آتا ہے۔ ''احساس'' پڑھتے ہوئے قارئین کو بھی یہی گمان ہوتا ہے۔

لداخی عام طور پر امن اور صلح پسند اور انسان دوست لوگ ہیں۔ لیکن بیرونی بہکاوے سے مُٹھی پر شر پسند بہک سکتے ہیں۔ تاہم ایک عام لداخی نے اپنے روایتی فرقہ ورانہ اتحاد کو آنچ آنے نہیں دیا۔ منفی جذبات پر ضمیر کی سچی آواز غالب آئی ہے اور دیرینہ اتحاد کو برقرار رکھا ہے۔ اسی محور پر ناول گھومتا ہے۔ ایک اچھے معلّم کی محنت رایئگان نہیں جاتی۔ کرداروں پر اسکے فکر و نظر کا اثر پڑ کر ہی رہتا ہے جس سے ایک ترقی پسند سماج نشو و نما پاتا ہے۔

مصنف نے اپنے ناول میں گوشت و پوست کے زندہ کرداروں کو پیش کیا ہے جنہیں ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ انسان فرشتہ نہیں ہوتا اور نہ شیطان۔ ہر انسان میں اچھائی یا برائی دونوں ہوتی ہے۔ ماحول ایک اچھے انسان کو بُرا اور بُرے کو اچھا بنا سکتا ہے۔

ناول میں رومان اور سسپنس ہے جو قاری کو مضطرب بھی کرتا ہے اور ایک ہی نشست میں کتاب ختم کرنے کی خواہش بھی جگاتا ہے۔ بہرحال مصنف کی یہ پہلی کاوش قابلِ تعریف ہے جو تحسین اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔

☆...... شیخ بشیر احمد

Printed at JK Offset Printers
315 Jama Masjid Delhi 110006